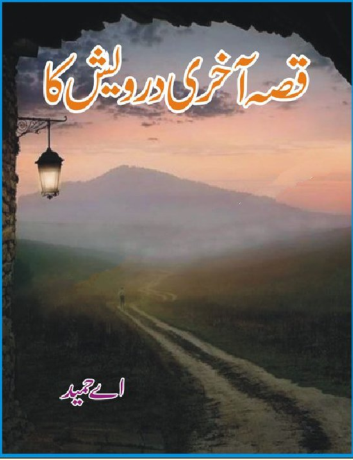
قصہ آخری درویش کا
اے حمید

قصہ آخری درویش کا

(طنز و مزاح)

اے حمید

قبر کا پرمٹ

ملک کی آبادی شتر بے مہار کی طرح بڑھ رہی ہے۔ ہر سال آبادی میں تشویشناک حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ حکومت آبادی کو کنٹرول کرنے پر ہر سال لاکھوں بلکہ کروڑں روپے خرچ کرتی ہے۔ مگر آبادی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ آبادی کا اس طرح بڑھتے چلے جانا کسی بھی ملک کے ترقیاتی منصوبوں میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ کثرت آبادی کا یہ عالم ہے کہ جہاں پہلے الو بولتے تھے۔ اب وہاں آدمی بولتے ہیں۔

کوئی آبادی سی آبادی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت اب غزلوں میں ملتے ہیں۔ زمین کے دشت نئی نئی آبادیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ پہلے گھروں میں کوئی کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ اب کسی کا دروازہ کھولو تو بچوں کی ایک قطار شور مچاتی باہر نکل آتی ہے۔

حضرات! یہ صورت حال ملک کی ترقی کے لئے تشویشناک اور ہمارے لئے فکر انگیز ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے ہمارا گھر ہے۔ ہمیں اسی ملک میں' اسی گھر میں رہنا اور ترقی کر کے اپنے ملک کو دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ اگر ہم نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد کوئی لائحہ عمل نہ اپنایا تو آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ آج سے پچاس ساٹھ برس بعد ملک کی آبادی کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور پھر لوگوں کی کیا حالت ہوگی؟ اگر آپ اندازہ نہیں لگا سکتے تو آیئے ہم آپ کو آج سے ساٹھ ستر سال بعد کی ایک عبرت انگیز تصویر دکھاتے ہیں۔ دیدہ عبرت اور گوش نصیحت کھلا رکھیئے۔

ساٹھ ستر سال گزر چکے ہیں۔ ملک کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ پہلے تل دھرنے کو جگہ مل جاتی تھی۔ اب تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں مل رہی۔ ہر طرف آدمیوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑکوں پر موٹر کاروں کی قطاریں لگی ہیں اور جوں کی چال رینگ رہی ہیں۔ بچہ صبح گھر سے روانہ ہوتا ہے اور رش کی وجہ سے شام کو سکول پہنچتا ہے۔ چنانچہ سکول اب دن کی بجائے رات کو لگتے ہیں۔ کوٹھیوں کی جگہ چار چار سو منزلہ ہائی رئیز بلڈنگیں بن گئی ہیں۔ ہر اپارٹمنٹ میں تین تین کنبے رہ رہے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ برتھ

بنے ہیں۔ان برتھوں پر بھی لوگ رات کو سوتے ہیں۔ جہاں پہلے ایک پل ہوا کرتا تھا۔اب وہاں اوپر تلے چار چار پل بنے ہوئے ہیں۔ایک پل سے لوگ پیدل گزرتے ہیں۔دوسرے پر سے موٹر کاریں گزرتی ہیں۔تیسرے پل پر سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں۔بے پناہ آبادی کی وجہ سے ریل گاڑیاں اتنی لمبی ہوگئی ہیں کہ جب لاہور سے ایک ریل گاڑی پنڈی کے لئے روانہ ہوتی ہے تو اس کا انجن پنڈی پہنچ چکا ہوتا ہے اور پچھلا ڈبہ بادامی باغ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ٹرین کے اندر ہی اندر دوسری ریل کاروں میں بیٹھ کر پنڈی پہنچتے ہیں۔آسمان پر ہوائی جہازوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ہوائی جہاز شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے پھر رہے ہیں۔مسافروں کی کثرت کی وجہ سے ہوائی جہاز کے پروں اور چھت کے اوپر بھی زائد نشستیں لگا دی گئی ہیں۔کچھ مسافروں کو شیشے کے کیپسولوں میں ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے۔

حکومت نے مجبوراً شادی پر خاص پابندی عائد کردی ہے۔اب ہر کوئی اپنی مرضی سے شادی نہیں کرسکتا۔شادی کرنے کے لئے سرکاری دفتر سے شادی کا پرمٹ لینا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ پرمٹ کے دفاتر میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک پیر ناتواں ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑکھڑاتا ہوا عصا ہاتھ میں لئے دفتر میں داخل ہوا۔پرمٹ کلرک نے غصے سے کہا۔

''بابا جی!تم شادی کا پرمٹ لے کر اب کیا کروگے۔؟

پیر ناتواں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر کہا۔

''برخودار میں شادی کا پرمٹ لینے نہیں بلکہ واپس کرنے آیا ہوں۔آج سے چالیس سال پہلے میں نے شادی کے پرمٹ کے لئے درخواست دی تھی۔اب مجھے پرمٹ موصول ہوا ہے۔یہ میرے واقعی اب کسی کام کا نہیں۔یہ کسی ضرورت مند کو دے دیجئے۔''

یہ پیر فرتوت کنوارا لڑکھڑاتا ہوا نکلتا ہے تو ایک بوڑھا جوڑا داخل ہوتا ہے۔جنہوں نے بالوں کو خضاب سے سیاہ فام کر رکھا ہے۔ مگر چہرے کی جھریاں بڑھاپے کا راز فاش کر رہی ہیں۔پرمٹ کلرک انہیں ایک نظر دیکھتا ہے اور بیزاری سے پوچھتا ہے۔

''تائی جی!تایا جی!خیر نال بچے کہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔''

کیونکہ پرمٹ کلرک کو خوب معلوم ہے کہ پرمٹ کی نایابی کے باوجود شادی کے پرمٹ بلیک میں ایک ایک لاکھ روپے کی عوض فروخت ہورہے ہیں اور لوگ ضد میں آکر دھڑا دھڑ بچے پیدا کر رہے ہیں۔جن کے ہاں دو بچوں کی استطاعت تھی۔وہ بارہ بارہ بچے پیدا کر چکے ہیں اور کوشش جاری ہے۔پہلے ماں باپ بچوں کو لے کر گھر سے نکلا کرتے تھے۔اب بچے ماں باپ کو ریڑھی میں ڈال کر نکلتے ہیں۔اسی لئے پرمٹ کلرک نے اس بوڑھے خضاب شدہ جوڑے سے ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا تھا۔دونوں

بوڑھے ایک ساتھ کلفی سے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے ہیں۔

''بیٹا! ہم تو اپنی شادی کے پرمٹ کا پتہ کرنے آئے ہیں کہ پرمٹ بنا ہے کہ نہیں؟''

پرمٹ کلرک جھنجھلا کر کہتا ہے:

''اگلے سال آنا تایا جی تائی جی۔''

شادی پرمٹ کساد بازاری اور نایافت کی وجہ سے جعلی شادی پرمٹوں کا کاروبار بھی اپنے عروج پر ہے۔ بڑے بڑے ماہر پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسے جعلی پرمٹ بناتے ہیں کہ ایک نظر میں کوئی نہیں پہچان سکتا۔ مگر پولیس کے مخبر بھی محکمے کو خبر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ پولیس گھروں میں اکثر چھاپے مارتی رہتی ہے اور نقلی پرمٹ پر شادی شدہ جوڑوں کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے۔ اکثر یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک بزرگ عورت اور بزرگ مرد کو پولیس پکڑ کر تھانے لئے جا رہی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے پچاس بچوں کی قطار لگی ہے۔ سب رو رہے ہیں چلا رہے ہیں۔

کوئی بڑا لڑکا پکارتا ہے۔

''ہمارے ابا! کو کہاں لئے جا رہے ہو۔

دوسرے لڑکے کی آواز آتی ہے:

''ہائے ابا: ہمارے ابا کو چھوڑ دو۔''

''آہ! امی کو چھوڑ دو۔''

سپاہی ڈانٹ کر کہتا ہے۔''چپ اوئے نقلی پرمٹ کی اولاد و۔''

تھانے پہنچ کر تحقیقات ہوتی ہے۔ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان بزرگوں کی شادی جعلی پرمٹ پر ہوئی تھی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ بچے جہاں سے آئے ہیں وہاں واپس نہیں جا سکتے۔

آبادی کی بہتات کے باعث شہر میں کوئی باغ کوئی فٹ پاتھ باقی نہیں رہا جہاں کبھی باغ اور پارک ہوا کرتے تھے۔ وہاں اب آدھے آدھے مرلے کے مکان ہی مکان نظر آتے ہیں۔ ان مکانوں کے اوپر اور ان کے بھی اوپر مکان بن گئے ہیں۔ فٹ پاتھوں کا بھی یہی حال ہے۔ پیدل چلنے والا فٹ پاتھ پر واقع کسی مکان کے غسل خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر میں جو چند ایک درخت باقی بچ گئے ہیں ان میں بھی لوگ پرندوں کی طرح گھونسلے بنا کر رہ رہے ہیں۔ درخت کے تنے پر مختلف تختیاں لگی ہیں۔

شیخ بخش الٰہی اکاؤنٹنٹ۔۔۔۔۔۔۔گھونسلہ نمبر 13-E

چوہدری کرم دین گھی والے۔۔۔۔۔۔۔گھونسلہ نمبر 14-B

مسٹر اینڈ مسز اے وائی لیکچرار

درخت کی آخری شاخ نمبر 21-C

شہر میں کثرت آبادی کی وجہ سے چار چار منزلہ بسیں چلتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بس کسی سٹاپ پر کھڑی ہوتی ہے تو مکان کی تیسری یا چوتھی منزل سے آدمی بریف کیس ہاتھ میں لئے مکان کی کھڑکی میں سے بس کی کھڑکی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے مکان کے نیچے اترنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ شاہراہ قائداعظم پر جو بھنگیوں کی توپ تھی۔ اس کے اندر بھی ایک آدمی رہتا ہے۔ وہ کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ شام کو دفتر سے واپس آکر گندھوئے کی طرح توپ کی نالی میں گھس کر سو جاتا ہے اور صبح گندھوئے کی طرح توپ کی نالی سے نکل کر اپنے دفتر کی طرف روانہ جاتا ہے۔ اسی طرح لاہور قلعہ اور مقبرہ جہانگیر میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ مقبرے کے چاروں طرف میناروں کی ہر منزل میں دو دو خاندان آباد ہیں۔ سکول جانے کے لئے بچوں کو اوپر ٹوکریوں میں ڈال کر نیچے لٹکا دیا جاتا ہے۔ جہاں ریڑھی والا انہیں بوریوں میں خربوزوں کی طرح ڈال کر سکول پہنچانے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔ پہلے باپ بچوں کو سکوٹروں کے پیچھے یا گاڑیوں میں اپنے ساتھ بٹھا کر سکول پہنچایا کرتے تھے مگر اب بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ سکوٹروں کے پیچھے لوڈر لگانے پڑتے ہیں۔ جو بچوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ گاڑی میں صرف ایک باپ ہوتا ہے۔ اور ہزاروں بچے ہوتے ہیں جو گاڑی کی سیٹوں گاڑی کی چھت اور ڈگی میں بھرے ہوئے ہوئے ہیں۔

خوشحال گھروں میں بھی تل دھرنے ک جگہ نہیں۔ رات کو فریج بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے تمام چیزیں نکال کر اندر بستر لگا دیے جاتے ہیں اور گھر کے دو تین افراد ان میں سوتے ہیں۔ غسل خانوں میں بھی فرشی بستر لگے ہیں۔

اس کثرت آبادی نے ایک اور بہت سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے اور یہ مسئلہ مرنے کے بعد غیر مسلم مردوں کو دفن کرنے کا ہے۔ جب آبادی اس خطرناک بلکہ المناک حد تک بڑھ جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک قبر میں صرف ایک مردہ آرام کرے۔ چنانچہ قبرستانوں میں بارہ بارہ منزلیں تعمیر ہونے لگی ہیں۔ ہر منزل میں سات سات قبریں ہوتی ہیں۔ ان قبروں میں بیٹھ کر آخری سفر کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ سلیپر بھی ہوتے ہیں اور لیٹ کر آخری آرام کرنے کے بوتھ بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی غیر مسلم مردوں کے لئے پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں مل رہی۔ قبروں میں برتھ سلیپر اور دوسری جگہ حاصل کرنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

آبادی میں بے پناہ اضافے کے باعث اموات کی شرح بھی بڑھ گئی ہے۔ مردوں کو دفن کرنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی۔ لوگ اپنے بزرگوں کو بتائے بغیر ان کی تدفین کے واسطے قبر حاصل کرنے کی پہلے ہی سے درخواستیں دے چھوڑتے ہیں۔ گھر میں جونہی کوئی آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو اس کے بچے خفیہ طور پر اس کی قبر کی الاٹمنٹ کے واسطے قبرستان کے محکمے کو درخواست بھجوا دیتے ہیں۔ جس گھر میں کسی عمر رسیدہ بزرگ کی قبر کے لئے الاٹمنٹ کا پرمٹ آ جاتا ہے تو سوائے اس بزرگ کے باقی سب گھر میں خوشیاں مناتے ہیں کہ اب ان کے بزرگ کی لاش بے گور و کفن نہیں پڑی رہے گی اور اس کی باقاعدہ تدفین کی جا سکے گی۔

اسی طرح ایک گھر میں ایک بے حد عمر رسیدہ غیر مسلم بزرگ کی قبر کا پرمٹ آ گیا تو گھر والے یوں خوش ہوئے جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہوں۔ کیونکہ بزرگ کی عمر سو کے قریب پہنچ چکی تھی اور پرمٹ کی خوشی ایشوع نہیں ہو رہی تھی۔ گھر والوں نے قبر کے لئے درخواست دس برس پہلے ہی دے رکھی تھی۔ دس برس بعد پرمٹ ملا تو گھر کے ایک فرد نے عمر رسیدہ بزرگ کو پرمٹ دکھا کر کہا:

''ڈیڈی! مبارک ہو۔ آپ کی قبر کا پرمٹ آ گیا ہے۔ بس اب آپ جلدی جلدی تیاری شروع کر دیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پرمٹ کی تاریخ نکل جائے۔''

عمر رسیدہ شخص اب آگے آگے ہے اور گھر والے اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ گھر والے بھی سچے ہیں کیا کریں۔ مرنا تو ایک وقت سب کو ہے۔ مگر آبادی کے بے تحاشا بڑھ جانے کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر پرمٹ کی تاریخ کے مطابق عمر رسیدہ شخص کا رحلت کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ لاش کو گھر میں کہاں تک رکھا جا سکتا ہے۔ عمر رسیدہ شخص سر جھکائے چارپائی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے اور گھر والوں کو تشویش لگ رہی ہے کہ پرمٹ کے ختم ہونے کی تاریخ قریب آ رہی ہے اور بڑے میاں ابھی تک سانس لئے جا رہے ہیں۔ آخر ایک ذمے دار آدمی عمر رسیدہ کے پاس آ کر کہتا ہے:

''بزرگو اب انتقال کر بھی جاؤ۔ پرمٹ کی ڈیٹ ایکسپائر ہو رہی ہے۔

یہ سنہری موقعہ پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔''

خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔ ہم نے آپ کو تصور ہی تصور میں آج سے سو سال بعد کا ایک فرضی نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی گئی تو ایسا وقت بھی آ سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آبادی کے تشویشناک اضافے کو مناسب حد تک روکیں اور اسے ایک خاص حد تک آگے نہ بڑھنے دیں۔ اسی میں ہمارے ملک کی ترقی اور خوشحالی ہے۔

◆◆◆

بھگت کبیر اور کیلے

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔

میں نیا نیا پنجاب کے ایک دور افتادہ شہر میں کلرک ہو کر آیا تھا اور چونکہ میرا مزاج بچپن ہی سے عاشقانہ ہے اس لئے وہاں جاتے ہی ایک ہندو لڑکی سے عشق لڑا بیٹھا۔ اس ہندو لڑکی کا نام شانتا تھا اور وہ ماتھے پر سرخ بندیا لگایا کرتی تھی۔ بڑی مذہبی لڑکی تھی اور ہر روز صبح کالی ماتا کے مندر پوجا کرنے جایا کرتی۔ کوئی دو ہفتے کی جدوجہد کے بعد میں نے شانتا کو اپنی طرف راغب کر لیا اور اسے سینما دیکھنے کی دعوت دے دی۔ اس چھوٹے سے پرانے شہر میں صرف ایک ہی سینما تھا۔ جہاں تک پہنچنے کے لئے نہر کے ساتھ ساتھ جانا پڑتا تھا۔ شانتا نے ایک سہیلی کے ہاں جانے کا بہانہ بنایا اور میرے ساتھ سینما دیکھنے چل پڑی۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کیونکہ سینما کے باکس میں لڑکی کو اپنی طرف مزید راغب کرنے کے کئی مواقع میسر آ سکتے تھے۔ ہم نہر کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چمکیلی دوپہر تھی۔ میں نے سوچا لڑکی ہندو ہے اس کے ساتھ ایسی باتیں کرنی چاہئیں جو اس کے دل میں میری طرف سے ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیں۔

میں نے کہا:

''میں تو کرشن مہاراج کا گرویدہ ہوں۔ ہندوستان کا بڑا گریٹ اوتار تھا اس کا تو انڈیا میں کہیں جواب نہیں۔ میں نے آج تک ایسا انسان نہیں دیکھا جو انگلی پر چکر گھما کر دشمنوں کا صفایا کر دے اور پھر کیسا تلوار چلاتا تھا۔''

شانتا نے خوش ہو کر کہا:

''تم کتنے اچھے لڑکے ہو!''

میں نے کہا:

''اور پھر رام کا تو جواب نہیں۔ بڑا گریٹ بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں اس کے راج میں آدمی اور شیر بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے اور دھوبی ایک گھاٹ پر کپڑے دھوتے تھے۔''

''بالکل ارام جی تو مہا پرش تھے۔''

''اجی ایسا راجہ تو شاید ہزاروں سال تک پیدا نہ ہو۔کیا بات کا دھنی تھا۔ظالم!صرف باپ کی آ گیا پالن کرنے کے لئے چودہ برس کا بن باس لے لیا۔''

شانتا مزید خوش ہو گئی۔

''تم کتنے اچھے ہو ساجن!تم تو بالکل ہندو ہو۔''

میں نے دل میں دوبارہ کلمہ شریف پڑھ کر کہا۔

''بالکل!بالکل!ہندوستان کا ہر آدمی ہندو ہے اور پھر میں تو ہندو۔

لڑکیوں کو دیویاں سمجھتا ہوں۔کیا بھجن کرتی ہیں کیا پوجا پاٹھ کرتی ہیں۔

کیا چھوٹی چھوٹی چپاتیاں پکاتی ہیں۔کیا عشق کرتی ہیں۔''

شانتا شرما گئی۔میں ہندو بزرگوں کی تعریف میں اس قدر آگے نکل گیا کہ میں نے راون کے بھی گن گانے شروع کر دیئے۔

''اور راون ہی کو لے لو۔کیا شاندار راجہ تھا۔بارہ سر اور بارہ ہاتھ میں نے آج تک اتنی خوبصورتی سے ساتھ ساتھ لگی بارہ گردنوں پر بارہ سر لگے نہیں دیکھے اور پھر کسی ہاتھ میں تلوار کسی میں بھالا کسی میں تیر کمان۔''

اچانک شانتا نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو جی!راون تو راکشش تھا۔وہ تو ہماری سیتا میا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔اس کے لئے تو ہمارے بھگوان کو یدھ کرنا پڑا تھا۔''

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ارے یہ میں کیا کہہ گیا۔میں نے شانتا سے کہا:

''اچھا یہ بات ہے!پھر تو یہ راون بڑا کمینہ آدمی تھا۔اس کی یہ مجال کہ سیتا جی کو اغوا کر کے لے جائے؟اگر مجھے کہیں مل جاتا تو میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔''

لیکن شانتا ناراض ہو گئی تھی اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور بولی۔

''جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔تم بڑے جھوٹے ہو۔تم نے میرا دل دکھا دیا۔

میں نے جلدی سے کہا۔

''شانتی! شانتی! شانتا!!!

بڑی مشکل سے شانتا کو راہ راست پر لایا۔ اب سنیما آ گیا تھا۔ اس سنیما کی دیواریں تو پکی تھیں۔ مگر چھت گھاس پھونس کی تھی۔ یہاں ''بھگت کبیر'' نامی فلم لگی تھی۔ اس فلم میں بھارت بھوشن اور مظہر خان وغیرہ نے کام کیا تھا۔ شانتا نے مسکرا کر کہا:

''بڑی اچھی فلم چل رہی ہے یہاں تو!''

میرا رنگ اڑ گیا۔ میں نے سوچا تھا۔ ''ہنٹر والی'' یا ''بمبئی والی'' قسم کی کوئی فلم لگی ہو گی اور ایسی فلم دیکھتے ہوئے شانتا کو راہ راست پر لانے میں آسانی ہو گی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ''بھگت کبیر'' فلم چل رہی ہو اور میں نے شانتا پر ہاتھ ڈالا تو وہ تو مجھے بھی راون ہی سمجھے گی۔! اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک آدمی لکڑی کے کھوکھے پر بیٹھا ٹکٹیں ہاتھ میں پکڑے مولی کھا رہا تھا۔ میں نے کہا:

''باکس کے ٹکٹ چاہئیں۔''

اس نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

''وہ سامنے والے آدمی کے پاس چلے جائیں۔''

یہ آدمی چارپائی پر بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔ اس نے بھی ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور باکس کے دو ٹکٹ دے دیئے اور پھر ایک آدمی کو آواز دے کر بولا:

کرم دین اوئے۔ انہیں بکس میں لے جا۔''

باکس بالکل باکس یعنی صندوق ہی تھا۔ پہلے تو اس کا تالا نہ کھلا۔ لوہے کی ایک سلاخ سے تالا توڑا گیا۔ اب دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ سنیما کے مالک اور بھنگی نے مل کر دروازہ کھولا۔ اندر بید کی دو کرسیاں پڑی تھیں جن پر گرد پڑی تھی۔ دونوں کرسیوں کے بازو ٹوٹے ہوئے تھے اور ایک کرسی کی ٹانگ بناوٹی یعنی اینٹوں کی تھی۔

ہال کی چھت پر بانس ادھر ادھر لگے ہوئے تھے ان بانسوں پر بے شمار کبوتر بیٹھے غرغوں کر رہے تھے۔ تھرڈ کلاس میں بوریا بچھا تھا۔ جس پر لوگ منڈلیاں بنا کر بیٹھے فصل کی کٹائی اور بیلوں کی بیماریوں پر باتیں کر رہے تھے کہیں کسی نے آگ جلا رکھی تھی اور کوئی حقے کی چلم میں تمباکو ڈال رہا تھا۔

سیکنڈ کلاس میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان چارپائیوں پر تماشبین حضرات کمبل اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک آدمی سر کی مالش

کروار ہا تھا۔ دوسرا ڈنڈے سے چارپائی کے کھٹمل جھاڑ رہا تھا۔

فرسٹ کلاس میں ٹین کی ٹھنڈی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تماش بینوں کی ٹانگیں سردی میں برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سن رہی تھیں۔ اوپر سے جب کوئی کبوتر بیٹ کرتا تو کوئی نہ کوئی تماش بین سر جھاڑ کر سنیما کے مالک اور کبوتر کی والدہ صاحب کو بڑی موٹی سی گالی سنا دیتا۔

سٹیج پر بھی ایک چارپائی بچھی تھی۔ اچانک ایک آدمی ایک بغل میں گراموفون اور دوسری بغل میں گراموفون کا دھوتو دبائے سٹیج پر آیا۔ اس نے چارپائی پر بیٹھ کر گراموفون کو چابی دی۔ دھوتو فٹ کیا اور ریکارڈنگ شروع کر دی۔

"مل کے بچھڑ گئیں اکھیاں"

تھرڈ کلاس والوں نے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ میں نے شانتا کا ہاتھ تھام کر کہا:

کہیں تم بھی اکھیاں ملا کر بھاگ تو نہیں جاؤ گی؟" شانتا بولی!

"بھگت کبیر جی کی فلم کب شروع ہو گی؟"

میں کانپ اٹھا۔ یہ بھگت کبیر آج رنگ میں بھنگ ڈال کر چھوڑے گا۔

جب سٹیج پر بیٹھ کر ریکارڈنگ کرنے والے کی سوئیاں ختم ہو گئیں تو اس نے دھوتو کھولا۔ گراموفون بغل میں دبایا اور لوگوں کی سیٹیوں اور گالیوں کے شور میں بھاگ گیا۔ اب ایک پگڑی اور تہمد والا آدمی ایک ہاتھ میں گھنٹی لے کر نمودار ہوا۔ وہ گھنٹی بجا رہا تھا۔ جس طرح اس کی گھنٹی مل رہی تھی۔ اسی طرح اس کا سر بھی ساتھ مل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

بھائیو: منڈوا شروع ہو رہا ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ پھر اس نے وہیں سے آپریٹر کو آواز دی۔

"شروع سے کر دے اوئے خانہ خراب دیا پترا۔"

ہال کے سارے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اندھیرا چھا گیا اور کڑک کڑک ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی فلم شروع ہو گئی۔ میں نے شانتا کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا۔ شانتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ کیونکہ ابھی بھگت کبیر چھوٹا تھا۔

تھوڑی دیر تک میں شانتا کے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار جو میں نے ذرا آگے بڑھنے کی یعنی ترقی کرنے کی کوشش کی تو اس نے بڑی تیزی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے دیکھا۔ سامنے پردے پر بھگت کبیر بڑا ہو گیا تھا اور بازار میں کھڑا بھگوان کی تبلیغ کر رہا تھا۔

یہ کمینہ فلم ایکٹر بھگت کبیر کا روپ دھا کر میرا مزہ خراب کر رہا تھا۔خون پی کر رہ گیا کیونکہ شانتا کے دل پر مذہبی فضا طاری ہو چکی تھی۔اچانک فلم ٹوٹ گئی۔لوگوں نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔جیسے ان کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔وہی گھنٹی والا شخص گھنٹی اور سر ہلاتا سٹیج پر آیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''بھائیو گھبراؤ نہیں فلم ٹوٹ گئی ہے ابھی جڑ جاتی ہے۔''

لوگوں نے اس پر گونگلو یعنی شلغم پھینکے۔فلم شروع ہو گئی۔اب کی دفعہ جو فلم ٹوٹی تو لوگوں کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں گھنٹی والے نے آ کر اعلان کیا۔

''بھائیو!! انٹرول یعنی آدھی چھٹی ہو گئی ہے۔''

ہال کے دروازے کھول دیئے گئے۔لوگ کمبل جھاڑتے ہوئے اٹھے اور باہر نکلنا شروع ہو گئے۔انہوں نے باہر جا کر حقے تازے کئے اور چلموں میں تازہ تمبا کو بھرنے لگے۔میں نے باہر جا کر شانتا کے لئے درجن بھر کیلے خریدے۔شانتا کیلوں کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔اس نے مجھ سے بھگت کی باتیں کرتے ہوئے کیلے کھانے شروع کر دیئے۔ایک دو' تین' چار' پانچ' رام رام شانتا پورے چھ کیلے کھا گئی۔ابھی میں دوسرا کیلا کھا رہا تھا۔میرا خون کھولنے لگا۔کیسی پیٹو لڑکی سے پالا پڑا ہے۔میں عشق کی بات کرتا تو وہ بھگت کبیر کی باتیں کرنے لگتی۔میں بوسہ لینے لگتا تو وہ کیلا کھانا شروع کر دیتی۔

اسی دوران میں وہی گراموفون والا شخص دوبارا سٹیج پر آ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی پسند کے گھسے ہوئے ریکارڈ بجا رہا تھا اور لوگ کبھی کبھی اس پر گونگلو پھینک دیتے تھے۔

چھت والے کبوتروں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ انٹرول ہو گیا ہے۔چنانچہ انہوں نے باہر جانے کی بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے بیٹھیں اور پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا۔جب لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے چارپائیاں اور کرسیاں اٹھا اٹھا کر زمین پر مارنا شروع کر دیں تو وہی گھنٹی والا گھنٹی اور کھوپڑی ہلاتا اندر آیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا:

''بھائیو فکر نہ کرو۔منڈوا شروع ہو رہا ہے۔''

اس کے بعد ایک بار پھر اس نے اپریٹر کو گالی دے کر فلم شروع کرنے کا حکم دیا۔دروازے بند ہو گئے اور فلم شروع ہو گئی۔کچھ وقت تو لوگ چپ رہے پھر انہوں نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔معلوم ہوا کہ فلم میں ریل غلط لگ گئی ہے اور بھگت کبیر ایک بار جوان ہونے کے بعد پھر بچہ ہو گیا ہے اور اپنی ماں کی گود میں پڑا غوں غاں کر رہا ہے۔گھنٹی والے نے چلتی فلم کے دوران میں ہی گھنٹی بجا کر

کہا۔

’’بھائیو! بھگت جی ابھی جوان ہو جاتے ہیں۔ اپنی جگہوں پر چپ چاپ بیٹھے رہو۔‘‘

چنانچہ وہ پوری ریل دوبارہ چلی اور جب کہیں جا کر بھگت کبیر صاحب جوان ہوئے۔ جس وقت بھگت کبیر بازار میں کھڑا ایک چلتی چکی کو دیکھ کر رو رہا تھا اور دوہے گا رہا تھا تو میں نے شانتا کے بازو پر ہاتھ پھیرا اس نے نفرت سے میرا ہاتھ پرے کر دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں ابھی تک دو کیلے پڑے تھے۔ شانتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے بایاں ہاتھ میرے کیلوں والے ہاتھ کی طرف بڑھایا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ذرا پرے کر دیا۔ شانتا بھی ہاتھ بڑھاتی گئی۔ میں نے کیلے دوسرے ہاتھ میں پکڑ لئے۔ شانتا کا ہاتھ میری ران پر پڑ گیا۔ وہ چونک اٹھی۔

’’اوئی رام! کیلے کہاں ہیں؟‘‘

میں نے روتے ہوئے دونوں کیلے اس کے حوالے کر دیئے اور بھگت کبیر کی جان کو بیٹھا روتا رہا۔ کم بخت نے رنگ میں خوب بھنگ ڈالی۔ فلم میں بھگت کبیر کے ساتھ بھی بری ہو رہی تھی۔ وہ جہاں جاتا لوگ پتھر مارتے اور سیٹھ پر خوشی سے اچھل پڑتا۔

’’واہ! واہ! کیا خوب؟‘‘

شانتا نے مجھے گھور کر دیکھا۔

’’کیا تم بھگت جی کے دکھوں سے خوش ہو رہے ہو؟‘‘

میں نے جلدی سے کہا۔

’’نہیں تو میں تو اس بات پر ہنس رہا ہوں کہ ایکٹر کیسی مسخروں ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔‘‘

ایک آٹا پیسنے والے نے اپنی آٹے کی چکی بند کر دی اور فقیر ہو گیا۔ کیونکہ بھگت کبیر صاحب ہر وقت اس چکی کو دیکھ کر روتے رہتے تھے اور لوگوں کے وہاں سے آٹا پسوانا بند کر دیا تھا۔ دکاندار کی دکانداری ختم ہو گئی۔ اور وہ فقیر ہو کر ایک دوسری چلتی چکی کے سامنے جا کر رونے لگا۔

ایک تو مجھے کرسی کے کھٹمل تنگ کر رہے تھے دوسرے شانتا تنگ کر رہی تھی اور تیسرے بھگت کبیر نے میری قسمت پر رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ مجھے پیشاب لگا۔ میں باہر گیا جس جگہ میں پیشاب کرنے گیا وہاں مجھ سے پہلے ایک گھوڑا پیشاب کر رہا تھا۔ گھوڑے نے خشمگیں آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہنہنایا۔ میں بھاگ کر واپس باکس یعنی صندوق میں آ گیا۔ فلم میں بھگت کبیر کا برا

حال ہو رہا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ اس کی ٹھکائی کر رہے تھے۔ مگر وہ مردکا بچہ دکانوں کے آگے کھڑے ہو کر رونے اور دوہے گانے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ جب میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ جو دو کیلے میں جاتی دفعہ کرسی پر رکھ گیا تھا۔ انہیں شانتا نے کھا لیا تھا اور اب بھگت کبیر کی حالت زار پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

؟ شانتا کیلے کہاں گئے؟''

اس نے آنکھیں پونچھ کر کہا:

میں نے کھا لئے چھوڑو ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھتے نہیں کبیر جی پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ ہائے کبیر جی۔''

میرا جی چاہا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے تمام آدمیوں پر ٹوٹ پڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دوں۔ اب کی بار جو فلم ٹوٹی تو گھنٹی والے نے سٹیج پر آ کر مسکرا کر کہا۔

''بھائیو! کھیل ختم پیسہ ہضم۔

اور کیلے بھی ہضم۔ لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور چار پائیوں پر سے اٹھ اٹھ کر کمبل جھاڑتے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ شانتا کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ بڑی بھولی لگ رہی تھی۔ شانتا تو بالکل گائے تھی۔ گائے کی طرح باتیں کرتی تھی۔ گائے کی طرح روتی تھی اور گائے کی طرح کیلے کھاتی تھی۔ میں نے واپسی پر اپنی خالی جیب میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔

''کیلے میٹھے تھے شانتا؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا:

کون سے کیلے۔ کیا میں نے کیلے بھی کھائے تھے؟

مجھے تو فلم میں اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا۔''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

◆◆◆

دو ایکسٹرا لڑکیاں

وہ ایکسٹرا لڑکیاں سرخی پوڈر تھوپے سیٹ پر ایک طرف کھڑی ہیں۔ دونوں دبلی پتلی ہیں۔ دونوں نے اپنی آنکھوں کے سیاہ حلقے پاؤڈر میں چھپا رکھے ہیں۔ اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔ ڈائریکٹر نے کہا تھا کہ تمہارا کام ٹھیک سات بجے شروع ہو گا۔ کھانا سیٹ پر ہی ملے گا۔ لیکن رات کے تین بج گئے ہیں اور دونوں ایکسٹرا لڑکیوں کا کام ابھی شروع نہیں ہوا۔ ویسے اس دوران میں ان دونوں سے یونٹ کے کئی آدمی مختلف کام لے چکے تھے۔ دونوں ایکسٹرا لڑکیوں کے چہروں پر تھکن اور پژمردگی کے آثار ہیں۔ نیند آنکھوں میں دم توڑ چکی ہے۔ کونے میں زمین پر بیٹھ کر ان لڑکیوں نے یونٹ کا بچا کھچا کھانا جانوروں کی طرح کھایا ہے۔ یونٹ کا ہر آدمی کھانا کھانے کے بعد بھوکی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ ہر مذاق کا جواب مسکرا کر دے رہی ہیں۔ وہ یونٹ کی ملکیت ہیں۔ ان سے ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ انہیں ہر فحش مذاق کا جواب خندہ پیشانی سے ہی دینا چاہیے۔ وگرنہ وہ ہیروئن نہیں بن سکتیں۔

ان میں سے ایک سیالکوٹ کی رہنے والی ہے اور دوسری جھنگ کی۔ سیالکوٹ والی کا نام رضیہ ہے اور جھنگ والی کا نام سکینہ۔ دونوں فلم میں کام کرنے کا شوق لے کر یہاں آئی ہیں اور یہاں آ کر انہیں معلوم ہوا کہ فلمی دنیا میں سوائے فلم کے اور ہر کام ہوتا ہے۔ ان دونوں کی ملاقات لاہور کے ایک سٹوڈیو میں ہوئی۔ جہاں وہ ایک فلم میں ہیروئن کی سہیلیوں کا پارٹ ادا کرنے آئی تھیں۔ رضیہ نے ماتھے پر بال کاٹ کر ڈال رکھے اور سکینہ نے بالوں میں لچھے ڈالے ہوئے تھے۔ دونوں بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلیاں بن گئیں۔ دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسری کو اپنی دکھ بھری زندگی کی کہانی سناتی رہیں۔

رضیہ سیالکوٹ میں ایک عدد خاوند اور دو بچوں کو چھوڑ کر لاہور آ گئی ہے۔ فلم میں کام کرنے کے علاوہ وہ شام کو لاہور کی سڑکوں پر گھوم پھر کر بھی کام کرتی ہے۔ اس کا خاوند اسے روز مارتا تھا۔ کیونکہ وہ گھر میں بن سنور کر رہتی اور فلمی گانے گنگنایا کرتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اسے لاہور لے جا کر فلم کی ہیروئن بنا دے۔ خاوند نے اسے مار مار کر الو بنا دیا۔ پھر وہ اسے تقریباً ہر روز مارتا اور الو بناتا۔ وہ خود الو نہ بن سکا۔ اس نے الو بننا گوارا نہ کیا۔ رضیہ کے دل میں فلم کے عشق نے جوش مارا۔ اس جوش نے اولاد کی محبت

کو پس پشت ڈال دیا۔ اور وہ ایک روز محلے کے سنار کے ساتھ لاہور آ گئی۔ سنار نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لاہور جاتے ہی اسے ہیروئن بنا دے گا۔ مگر اس نے لاہور آ کر اسے ایک مکان میں بند کر دیا اور اس سے عیاشی کرنے لگا۔ اور جب اس کا جی بھر گیا اور جیب خالی ہو گئی تو اس نے دوسروں کو رضیہ سے عیاشی کی دعوت دے کر اپنی جیب بھرنی شروع کر دی۔ رضیہ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ کر سکی۔

ایک روز اس کے پاس ایک فلمی گاہک آ گیا۔ رضیہ نے اس سے ہیروئن بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فلمی گاہک نے جو وقتی عاشق تھا، رضیہ کو خوشخبری سنائی کہ وہ اپنی اگلی فلم میں اسے مسرت نذیر کی جگہ لینے پر تیار ہے۔ رضیہ اس کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی اب اس کے بھاگنے کا دور شروع ہو گیا۔ وہ ہر آدمی کے پاس بھاگ کر جاتی اور پھر ایک روز اس کے پاس سے بھی بھاگ کھڑی ہوتی۔ وہ ایک مفرور مجرمہ بن کر رہ گئی۔ جو گھر کی چار دیواری سے بھاگ نکلی تھی اور جسے کہیں بھی پناہ نہ مل رہی ہو۔ بھاگتے بھاگتے اس کا دم پھول گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ گال زرد ہو گئے۔ سینہ ڈھلک گیا۔ کولہے پچک گئے اور گردن کی ہڈی نظر آنے لگی۔

فلم کے ہر آدمی نے کچھ روز اسے اپنے پاس رکھا اور پھر اسے بھگا دیا۔ اب اسے ہیروئن کے شوق کے ساتھ پیٹ کی آگ بھی سرد کرنی پڑتی تھی۔ شوق سے وہ فلمی دنیا میں آ گئی اور پیٹ کے لئے اسے ہر فلمی وغیر فلمی آدمی کے پاس جانا پڑتا۔

سکینہ جھنگ شہر کے ایک محلے میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی شادی ایک چپڑاسی سے کر دی۔ چپڑاسی کی داڑھی تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا لیکن فلمی گیت کا ریکارڈ وہ ایک وقت بھی نہیں سن سکتا تھا۔ سکینہ کا یہ حال تھا کہ وہ سوائے فلمی گیتوں کے اور کچھ سن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس پر سوائے فلمی گیت کے اور کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ چپڑاسی خاوند کے پاس فلمی گیتوں کے پلاٹ اور ریڈیو نہیں تھا بلکہ اس نے سکینہ کو منع کر رکھا تھا کہ وہ اس کے گھر میں کبھی فلم کا گانا نہ گنگنائے۔

اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا جو اکثر ایسے حالات میں نکلا کرتا ہے۔ سکینہ کو بھی ایک فلمی گیتوں کا شیدائی مل گیا۔ اس نے سکینہ سے وعدہ کر لیا کہ اگر وہ اس کے ساتھ لاہور بھاگ چلے تو وہ اسے نیلو بنا دے گا۔

"صبیحہ کو بھی میں نے ہیروئن بنایا تھا۔"

سکینہ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ایک روز تھوڑا بہت زیور ساتھ لیا۔ چپڑاسی خاوند کو سوتا چھوڑ اپنے عاشق کے ساتھ جھنگ سے ریل میں سوار ہو کر لاہور آ گئی۔

لاہور پہنچ کر سکینہ کا بھی وہی حال ہوا جو رضیہ کا ہوا تھا اور جو فلم کے شوق میں گھر سے بھاگی ہوئی ہر رضیہ اور ہر سکینہ کا ہوتا ہے۔
سکینہ بھی کئی ایک آدمیوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی فلم کے سٹوڈیو میں آئی اور یہاں ہر آدمی کے ہاتھ میں کھیلنے لگی۔ کھیلتے کھیلتے اس کی آنکھوں میں بھی حلقے گہرے ہو گئے۔ رخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ سینہ ڈھلک گیا شوق کا نشہ اتر گیا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا اور وہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ اب اس کے لئے صرف فلمی گھاٹ ہی رہ گیا تھا۔ جس پر وہ بار بار پانی پیتی اور ہر بار اس کی پیاس میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو جاتا۔
رات کے پانچ بج رہے ہیں۔ دونوں ایکسٹرا لڑکیاں سو گئی ہیں۔ ان کے چہروں پر مردنی اور بے چارگی ہے۔ ان کا کام نہیں ہوا۔ لیکن کئی لوگوں کا کام ہو گیا۔ اس وقت سیالکوٹ اور جھنگ میں صبح ہو رہی ہے۔ رضیہ کے دونوں بچے سیالکوٹ والے گھر میں اپنے باپ کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں اور ان کا باپ ان کے لئے چائے بنانے کے لئے آگ جلا رہا ہے اور دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ معلوم نہیں وہ رو رہا ہے۔
ادھر لاہور کے ایک بس سٹاپ پر جھنگ سے آئی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت اپنی بیٹی کی تلاش میں بیٹھی ہے اور راہ گیر سے پوچھتی ہے۔

’’تم نے میری سکینہ کو تو نہیں دیکھا۔‘‘

◆◆◆

گوتما نہیں آئی

گوتمانے کہا تھا کہ وہ شام کوضرور آئے گی۔مگر شام ڈوبنے لگی ہے اوروہ ابھی تک نہیں آئی۔میں ہوٹل کے لان میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا ہوں۔پال میرے پاس بیٹھا مصری سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ گوتما نہیں آئے گی۔ایسی لڑکیاں کبھی وعدے پر پوری نہیں اترتیں۔لیکن مجھے یقین ہے کہ گوتما ضرور آئے گی۔وہ وعدے پر ضرور پورا اترے گی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے وہ بڑی پیاری ہے۔اس نے چاندنی راتوں میں چاندنی کا سہارا لے کر اپنی محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔اس نے محبت کے دیوتا کے سامنے سر رکھ کر مجھ سے پابندیٔ وفا کا عہد اٹھایا تھا۔گوتما کتنی خوبصورت ہے۔گول گول چہرہ شربتی آنکھیں اور جوڑے میں لگا ہوا تازہ گلاب کا پھول وہ خود بھی ایک پھول ہے۔تازہ گلاب کا پھول۔

ہم دونوں ایک مدت سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔وہ میری محبت میں مجھ سے بھی آگے نکل گئی ہے۔مگر پال کو اس کی محبت اور وفا پر بھروسہ نہیں۔وہ کہتا ہے کہ گوتما مجھ سے کبھی محبت نہیں کرتی۔کیونکہ اس کے خیال میں ایسی لڑکیاں کبھی محبت نہیں کرتیں۔وہ محبت کرنا جانتی ہی نہیں۔

شام ہونے لگی ہے اور گوتما ابھی تک نہیں آئی۔شانتی آگئی ہے۔شانتی بڑی ماڈرن لڑکی ہے۔اس کے ہونٹوں کے خم بڑے معصوم ہیں۔اس کی معصومیت دیکھ کر مجھے بالی کا خیال آجاتا ہے۔بالی۔جسے میں اس کے گھر پر ہی ملا تھا۔اس کی ماں اور چھوٹی بہن کے سامنے اس کی ماں چرخہ کات رہی تھی اور اس کی چھوٹی بہن سکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔

میری ملاقات اس کی ماں سے پہلے ہوئی اور بالی سے بعد میں۔اس گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ بالی کی ماں مالک مکان کے سامنے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

’’میں کیا کروں میرے پاس تو کھانے کو بھی کچھ نہیں۔میں تمہیں مکان کا کرایہ کہاں سے دوں۔‘‘

اور مالک مکان مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا۔میں نے غریب لوگوں کے لئے کوئی لنگر نہیں کھول رکھا۔کرایہ دو۔نہیں تو صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لو۔

بوڑھی عورت روتی رہی اور مالک مکان چلا گیا۔ میں نے قریب جا کر عورت کی تشفی کی اور کہا:

''فکر نہ کرو۔ میں تمہارے مکان کا کرایہ ادا کر دیتا ہوں۔''

اور میں نے مکان کا کرایہ ادا کر دیا۔ محض انسانی ہمدردی کی وجہ سے۔ لیکن جب اس کے بلانے پر اندر مکان میں گیا تو دیکھا وہاں اس کی بیٹی بالی بھی تھی۔ جس کا جسم جوان تھا اور آنکھیں بڑی تھیں اور ہونٹوں کے پاس بڑا لطیف خم تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا میں انسانی ہمدردی کے علاوہ خوبصورت آنکھوں اور بھرے بھرے جسم والی بالی بھی ہوتی ہے۔ میں نے اس بوڑھی عورت کی خاطر مکان کا کرایہ ادا کیا تھا اور بالی کی خاطر اس گھر میں باقاعدہ آنے جانے لگا۔ عورت نے ہمسایوں کو کہہ دیا کہ میں کا دور کا رشتہ دار ہوں۔ میں جب ان کے ہاں جاتا تو بالی میرے لئے چائے بنا کر لاتی۔ میں ہر بار انہیں کچھ نہ کچھ دے آتا۔ کچھ انسانی ہمدردی کے لئے' کچھ بالی کے لئے۔ بالی میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ میں اگر اس کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا دیا کرتی اگر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا تو وہ شرما جایا کرتی۔

ایک روز میں اس کے گھر گیا تو وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں سوت لے کر بازار گئی ہوئی تھی۔ چھوٹی بہن دوسرے کمرے میں بیٹھی سکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

خدا بڑا عظیم ہے جس نے یہ جہان بنایا اور جہاں میں خوبصورت بالی کو بنایا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں بالی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی سکوں اور اس کے کندھے کو پیار سے دبا سکوں اور وہ مجھے کچھ نہ کہہ سکے۔ بالی نے میرے لئے چائے بنائی۔

جب وہ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں دینے لگی تو میں کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔

''کوئی دیکھ لے گا''

''یہاں کوئی نہیں ہے بالی''

اور واقعی وہاں میرے اور بالی کے سوا اور کون تھا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو میرے خیال میں بالی کبھی مزاحمت نہ کرتی۔ کیونکہ اب میں ہر ماہ ان کے مکان کا کرایہ ادا کرتا تھا۔

میں نے بالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بالی نے ایک جھرجھری سی لی اور پیالی میز پر رکھ دی اور میں نے اپنے ہونٹ بالی کے

ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ بالی کے ہونٹ خشک تھے۔ گلاب کی پتی کی طرح جو تیز ہواؤں میں اڑی جا رہی ہو۔ ان ہونٹوں میں خوشبو بھی تھی اور نمی بھی۔ موتیئے کے پھول کی طرح' جو رات بھر بھیگتا رہا ہو اور جس کا منہ سورج کی کرن پہلی بار چوم رہی ہو۔ اس کے بعد میں اور بالی کمرے میں اکیلے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور دروازے کے باہر بالی کی چھوٹی بہن اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

میں نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات بج گئے تھے۔ مگر گوتما ابھی تک نہیں آئی تھی۔ پال مصری سگریٹ کیس میں سے ساتویں بار سگریٹ سلگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''پیارے گوتما یہاں نہیں آئے گی۔ وہ تم سے کبھی نہیں ملنے آئے گی۔ میں حیران ہوں کہ تم اس زمانے میں بھی لڑکیوں کا انتظار کرتے ہو۔''

میں نے کہا: ''پال تم گوتما کو نہیں جانتے۔ وہ دیوی ہے محبت کی دیوی۔ وہ صرف محبت کرنے کے لئے زندہ ہے اور صرف مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ ضرور آئے گی۔''

پال نے کہا: ''لیکن وہ ایک سال سے تمہیں نہیں ملی۔ تم ایک سال کے بعد اس شہر میں آئے ہو اور تم نے صرف فون پر گوتما سے بات کی ہے اور اس کی بات پر اعتبار کر لیا ہے۔ تمہیں کیا خبر اس ایک سال میں اس پر کیا کچھ نہیں بیت چکا۔ پیارے تم گاؤں میں رہ کر آئے ہو اور گاؤں میں زندگی کا ایک سال گزرتا ہے تو شہر میں بیس سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ جتنی دیر میں کسان کا ہل کھیت کا ایک چکر پورا کرتا ہے اتنی دیر میں شہر کی لڑکی دو عاشق بدل چکی ہوتی ہے۔''

اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا پال کی باتیں مجھے بے معنی معلوم ہو رہی تھیں۔ دنیا بدل سکتی ہے مگر میری گوتما نہیں بدل سکتی۔ پال نے مجھے سگریٹ دیا۔

''لو پیو اور انتظار کی کوفت دور کرو۔''

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ میرے سامنے ڈانس پر کچھ جوڑے ہلکی ہلکی موسیقی پر رقص کر رہے تھے۔ رقص کے دائرے ان کے پاؤں میں ٹوٹ ٹوٹ کر بن رہے ہیں۔ ایک لڑکی نے بالوں کا جوڑا بنا کر جوڑے میں گلاب کے پھول لگا رکھے تھے۔ گلاب کے سرخ پھول! گلاب کے سرخ پھولوں میں نمی بھی ہوتی ہے اور حسن بھی اور خواہشات کا سمندر بھی۔ میں بھی انہیں خواہشات کے سمندر میں بہتے بہتے ان رقص کرنے والی لڑکیوں کے ان گنت نیم شکستہ دائروں میں شریک ہو گیا اور

جب گلاب کے سرخ پھول مجھ سے جدا ہوئے تو میں نے گوتما کو ہوٹل کے لان میں داخل ہوتے دیکھا۔

میں خوشی سے پاگل ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ گوتما نے بالوں میں موتیا کے پھول لگا رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے پر وہی معصوم خم تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ میں نے لپک کر گوتما کا ہاتھ تھام لیا۔ گوتما کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحے کے لئے سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کا خم غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھی نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ گوتما نے اپنے بالوں میں موتیا کے پھول ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''ان سے ملئے! یہ ہیں میرے شوہر شرما صاحب''

.... اور شرما صاحب یہ ہیں.......

گوتما میرا تعارف اپنے شوہر سے کرا رہی تھی اور میرے ذہن میں ہزاروں سورج مکھی اور گلاب کے پھول دہکتی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں پال کا جملہ گھوم رہا تھا۔

''پیارے تم گاؤں میں ایک سال گزار کر آ رہے ہو۔ جتنی دیر میں کسان اپنے ہل سے کھیت کا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ اتنی دیر میں شہر کی لڑکی دو عاشق بدل چکی ہوتی ہے۔

◆◆◆

مری کی ایک رات

شیشم کو میں نے پہلے دن چشمے پر بکری کو پانی پلاتے دیکھا۔
یہ چشمہ ہمارے کالج سے ذرا نیچے جا کر پہاڑی کے دامن میں تھا۔ذرا اوپر ناشپاتی کا ایک پیڑ تھا۔جس کی ٹہنیاں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں اور جھکی ہوئی۔ شیشم بھی اسی طرح پھلوں سے لدی ہوئی چشمے پر جھکی ہوئی بکری کو چشمے پر پانی پلا رہی تھی۔ دو تین شرارتی لڑکے ناشپاتی کے درخت کی شاخوں کو زور زور سے ہلا رہے تھے۔ایک ناشپاتی لڑھک کر چشمے میں آن گری۔ شیشم نے مسکرا کر اوپر لڑکوں کو دیکھا اور ناشپاتی چشمے کے ٹھنڈے پانی میں سے نکال کر کھانے لگی۔بکری نے پرشوق نگاہوں سے شیشم کو دیکھا۔

''ہو ہو نہیں نہیں۔تم کھاؤ گی پیٹ میں درد ہوگا۔''

شیشم بکری کو چھڑی سے ہنکاتی ہوئی سر سبز تلے کی جانب چل پڑی۔ میں چیڑھ کے ایک درخت کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔شیشم میرے قریب سے گزری اور ذرا سی مسکرا دی میں بھی ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ ہرنی کی طرح بھاگ گئی۔ میں پتھر پر بیٹھا تھا• بت بنا پتھر بنا۔شیشم کے گال سیب کے چھلکے کی طرح سرخ تھے۔رنگ سیب کے گودے کی طرح سفید تھا۔وہ ایک جنگلی سیب تھی۔ جسے قدرت نے پہاڑ کی چوٹی پر اگایا تھا۔جس کی آبیاری شفاف چشمے کے ٹھنڈے پانی نے کی تھی۔ جسے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے آنے والی پاکیزہ ہواؤں نے پروان چڑھایا تھا۔جس کے رنگ میں قوس قزح نے اور جس کی خوشبو میں پہاڑ کے سارے پھولوں نے مل کر حصہ لیا تھا۔

دوسرے روز میں نے اسے پوچھا۔

''شیشم !تمہارا نام شیشم کیوں ہے۔''

وہ چشمے پر پانی بھر رہی تھی۔اس نے گاگر اٹھاتے ہوئے کہا:

''میرے باپو کو پتہ ہوگا۔''

سیاہ لٹ پھسل کر اس کے ماتھے پر آگئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے وہ لٹ پیچھے کر دوں۔مگر شیشم ٹیلے کی چھوٹی سی

پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ شیشم اگر دیودار یا چیڑ کا درخت بھی ہوتی تو میں اس سے ضرور محبت کرتا۔ تیسرے روز میں نے شیشم کو ایک ریشمی رومال کا تحفہ دینا چاہا۔ شیشم نے مسکرا کر لینے سے انکار کر دیا۔

''نا بابو ہم ایسا نہیں کرتے۔ یہ رومال ہمارے کس کام کا؟''

میں نے سوچا کاش میں لاہور سے شیشم کے لئے پانچ سیر امرتسری باقر خانیاں ساتھ لے آتا۔ وہ باقر خانی چائے میں بھگو کر کھاتی اور مجھ سے عشق کرتی۔ کیونکہ عورت اور باقر خانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح باقر خانی کی کئی ایک تہیں ہوتی ہیں اسی طرح عورت کی شخصیت بھی تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ باقر خانی بھی اس وقت تک نہیں حل ہوتی جب تک اسے محبت کی گرم چاشنی میں ایک ڈبکی نہ دی جائے۔

باقر خانی زندہ باد!

میں نے محبت کا سماوار گرم کرنا شروع کر دیا۔ اس خیال سے کہ شیشم کی باقر خانی کو پیار کی چائے میں ڈبو کر نرم کیا جائے۔ مگر شیشم کے ضمیر میں ٹاہلی کے درخت کی سی پختگی اور پائیداری تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی اور ایک دو باتیں کرنے کے بعد آگے نکل جاتی اور میں پیچھے رہ جاتا۔ اتنا پیچھے کہ مجھے شیشم کا ایک سایہ سا افق کی لکیر میں گم ہوتا دکھائی دیتا۔ ایک روز سماوار میں پانی جوش کھانے لگا۔ ٹونٹی میں سے بھاپ نکلنے لگی۔ میں نے شیشم کو چیڑ کے درختوں میں ایک جگہ روک لیا اور اس کا کھردرا ہاتھ تھام کر کہا۔

''شیشم میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم چشمے کا پانی ہو اور میں چشمے کا پتھر ہوں۔ تم نہیں ہوتیں تو میں جب بھی سوکھی ریت کے ساتھ سر لگائے تمہاری راہ دیکھا کرتا ہوں۔ میں طویل برف باری کی راتوں کو اس ویرانے میں پڑا باہر کے چمکیلے دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ جب برف کی تہوں میں سے پانی کی پہلی لکیر پھوٹ کر چشمے کی زندگی کا آغاز کرے گی اور ناشپاتی کے پیڑ پر محبت کا پہلا سفید شگوفہ پھوٹے گا۔ شیشم میں تمہاری محبت میں اس سرخ پھول کی طرح ہوں جو گہری کھائی میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر اگا ہوا اور کسی کو علم نہ ہو۔

شیشم کو بھی میری باتوں کا کوئی علم نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی سر پیر نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ مجھے اس کا سر پیر جسم کا ایک ایک حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں شیشم سے بالکل اسی طرح عشق کرتا تھا جس طرح ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانے والا آدمی تھوڑی دیر کے لئے بیرے میں بڑی دلچسپی لینے لگتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جب پہاڑ پر ہوں۔ شیشم کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے خوب سیر ہو کر کھانا کھاؤں۔ چائے پیو اور جاتے ہوئے شیشم کو اپنی کچھ روز کی مسرت کا ٹپ دیتا جاؤں۔ میں شہر کا باشندہ ہوں اور شہر والے محبت میں

دریا پار نہیں کر سکتے۔ ران چیر کر کباب نہیں بنا سکتے۔ تیشے سے سر نہیں پھوڑ سکتے۔ اگر میں مہینوال کی جگہ ہوتا تو سوہنی کے سارے برتن بھانڈے بیچ کر ایک ہفت روزہ فلمی اخبار نکال لیتا اور سوہنی کو فلم ایکٹرس بنا دیتا۔ فرہاد ہوتا تو اپنا سر پھوڑنے کی بجائے اس عورت کا سر پھوڑ دیتا جو مجھے شریں کی موت کی خبر سناتی۔ رانجھا ہوتا تو فقیر ہونے کی بجائے ہیر کے خاوند سے دوستی پیدا کرتا اور پھر اس کے گھر جا کر اس کی بیوی سے چوری چھپے ملا کرتا اور اپنی ران چیر کر اپنی محبوبہ کے لئے کباب بنانے کی بجائے اسے شیزان کے سینڈوچز کھلاتا۔ کیونکہ ہمارا یہ مقولہ ہے کہ نیکی کر کے دریا میں نیکی کو نہیں بلکہ نیکی کرنے والے کو ڈالنا چاہیے۔

میں شیشم کی گردن، ران اور سینے سے عشق کر رہا تھا۔ میں اسے مجنوں کی نظر سے نہیں بلکہ قصاب کی دلروز نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیشم بھی مجھے بکری کی ڈرپوک نگاہوں سے دیکھا کرتی اور وحشت کھایا کرتی۔ میں شیشم کو فلمی مکالموں کے ذریعے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ میری طرف بکری کی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر مسکرا دی۔

''تم کیا کہہ رہے ہو بابو''

میں نے کہا:

''میں تمہارا عاشق ہوں شیشم!''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہ عاشق ایک فونٹن پن ہوتا ہے۔ شیشم جس کی سیاہی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں تمہارا فونٹن پن ہوں۔ مجھے زمین پر سے اٹھا کر بڑی محبت سے اپنے گریبان میں لگا لو۔

شیشم نے مجھے اٹھانے کی بجائے بکری گود میں اٹھا لی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور شہر والوں کی سی مستقل مزاجی کے ساتھ اس امپورٹ کے لائسنس کے پیچھے لگا رہا۔

آخر ایک دن میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے شیشم کے لئے مال پر سے ایک ریشمی کپڑے کا ٹکڑا اور پاؤڈر کا ڈبہ خریدا اور اسے پیش کر دیا۔ شیشم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ باقر خانی نے چائے کی پیالی میں پہلی ڈبکی کھائی۔ اس کا نصف حصہ نرم ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اسے ایک نقلی موتیوں کا ہار دیا۔ باقر خانی کا نصف حصہ بھی چائے میں ڈوب گیا۔ میں نے چائے کی پیالی میں چھلانگ لگا دی۔ شیشم نے رات کو آنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ جب تک شیشم نہ آئی میں پاگل بلے کی طرح کالج کے کمروں میں پھرتا رہا۔ آدھی رات کو

جب چیڑ کے جنگل میں اندھیرا چھا گیا تو شیشم آئی۔ اس نے گلے میں نقلی موتیوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ میں نے شیشم کو گلے سے لگا لیا۔ شیشم میرے گلے سے لگی اپنے گلے کی مالا سے کھیلتی رہی اور میں اس سے کھیلتا رہا۔ جب ہم دونوں اپنے اپنے کھیل سے تنگ آ گئے تو وہ چلی گئی۔

اب وہ ہر رات کو گھر والوں سے چھپ کر میرے پاس کھیلنے کو آ جاتی اور ہم دونوں دیر تک کھیلتے رہتے اور جب تھک جاتے تو ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے۔ آخر ایک دن ہم دونوں اس کھیل سے تنگ آ گئے۔ شیشم نے اسے بتایا کہ اس کا خاوند راولپنڈی میں کہیں چوکیداری کرتا ہے۔ لیکن مجھے اس کے خاوند سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب مجھے شیشم سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ اب مجھے مال روڈ پر ایک اور شیشم مل گئی تھی۔

شیشم کو بھی اب مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی ایک اور قصاب تلاش کر لیا تھا۔ وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ کھلاڑی چاہے کوئی بھی ہو۔ میں مری سے واپس ہو گیا۔

چھرہ پانی پر آ کر بس کھڑی ہوئی تو میں نیچے اتر کر ایک چائے خانے میں آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں چائے پینے لگا۔ ابھی ایک بس راولپنڈی سے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک دیہاتی اتر کر میرے پاس چائے خانے میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور جیب سے دیسی بسکٹ نکال کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔ چائے کے قطرے اس کے منہ سے گر گر کر اس کے ملیشئے کی قمیض پر گر رہے تھے۔ اچانک میرا ہاتھ لگا اس کا ایک تھیلا نیچے گر پڑا۔ میں نے معذرت کی وہ دیہاتی مسکرا دیا۔

''کوئی بات نہیں بابو جی''

میں نے یونہی پوچھا۔

''اس میں کوئی ٹوٹنے والی چیز تو نہیں تھی؟''

''جی نہیں بابو جی۔ اس میں تو چھینٹ کا ایک ٹکڑا ہے اور مہندی ہے۔ اصلی مہندی بابو جی۔ دیکھئے تو ذرا''

اس نے مہندی کا لفافہ مجھے دکھایا اور چھینٹ کا ٹکڑا سبز چھینٹ پر بسنتی چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ دیہاتی کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔

''ایک سال بعد گھر جا رہا ہوں بابو جی! میری بیوی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔

بابو جی وہ مجھ سے بڑی محبت کرتی ہے۔ ہر روز مجھے پٹواری سے خط لکھوا کر ڈالتی تھی۔ میرے سرتاج تم مجھ سے دور کیوں ہو۔ تم

کب گاؤں آؤ گے۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔

دیہاتی بے وقوفوں کی طرح ہنس پڑا۔

''اور تب تو وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔''

''کیوں نہیں بابو جی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ تو میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔

دیکھئے! یہ چھینٹ پیاری ہے ناں۔ میں یہ اپنی بیوی کے لئے لے جا رہا ہوں۔ اور بابو جی میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اسی روپے جمع کر رکھے ہیں۔ یہ سارے کے سارے روپے شیشم کو دوں گا۔

''بابو جی!....... شیشم مجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔''

میں چونک پڑا۔

بابو جی! شیشم ہے وہ سیب کی طرح سرخ اور.......

اس کے بعد میں کچھ نہ سن سکا۔

دیہاتی مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اپنی بیوی کی یاد میں سرخ ہو رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں چائے نہیں پی رہا بلکہ اپنے سگے بھائی کا خون پی رہا ہوں۔

◆◆◆

فلمی کہانی اور تربوز

فلم رائٹر نے چق اٹھائی اور دفتر میں داخل ہو گیا۔ آج اسے ملک جوئندہ یابندہ نے بلایا تھا۔ ملک جوئندہ یابندہ نے اپنے دو چار ساتھیوں سے مل کر یا وہ دو چار ساتھی ملک صاحب سے مل کر ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے تھے اور انہیں کسی ایسی کہانی کی ضرورت تھی جو سوشل بھی ہو، تھوڑی سی فائٹنگ بھی ہو۔ جادوئی بھی ہو اور جاسوسی بھی ہو۔ ملک صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک دوست کا دوست فلم رائٹر ہے اور وہ ان کے مطلب کی کہانی لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست کی وساطت سے اس کے دوست سے بات کی۔ اس شخص نے فلم رائٹر سے بات کی فلم رائٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور وقت مقرر پر ملک جوئندہ یا بندہ کے دفتر میں آن حاضر ہوا۔

ملک صاحب اس وقت صوفے پر نیم دراز تھے اور اپنا دایاں ہاتھ پشت پر لے جا کر ریڑھ کی ہڈی کو کھجلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلم رائٹر کو دیکھ کر انہوں نے ہاتھ پیچھے سے نکال کر آگے کر لیا اور بولے:

''آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

فلم رائٹر نے کہا:

''میرا نام شارک مچھلی شہری ہے حضور اور یہ خاکسار فلم رائٹر ہے۔ آپ کے دوست جناب فشی لدھا صاحب کے دوست جناب ادھا صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ آپ کوئی فلم بنا رہے ہیں۔ جس کی کہانی ملک جوئندہ نے ران پر زور سے ہاتھ مارا۔

''بہت خوب، بہت خوب!''

''آپ ہیں شارک مچھلی شہری''

''جی حضور! جی حضور!''

''بہت خوب تو آپ کہانی لائے ہیں؟''

''کیوں نہیں حضور۔''

اتنے میں ملک صاحب کے ایک اور دوست بھی آ گئے۔اس قلم میں ملک صاحب کے دست راست تھے۔ان کا نام خدا بخش گھگہ تھا۔گھگھ صاحب سے ملک جوئندہ نے شارک مچھلی شہری کا تعارف کروایا۔گھگہ صاحب نے آگے بڑھ کر شارک مچھلی شہری سے مصافحہ کیا اور رائٹر نے ذرا مسکرا کر کہا:

''معاف کیجئے گا۔میں ذرا وضع دار آدمی ہوں اور اپنے کسی بھی دوست کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاتا۔چنانچہ یہ خاکسار آپ کی تفریح طبع کے لئے ایک عدد تربوز ساتھ لایا ہے۔اجازت ہو تو میں حاضر کر دوں۔''

ملک صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا:

''اس کی کیا ضرورت تھی۔شارک صاحب''

''اجی یہ تو میری خوشی کا معاملہ ہے۔''

''آپ کا چپڑاسی کہاں ہو گا؟''

''باہر ہو گا۔کیوں خیریت ہے؟''

''کچھ نہیں۔ویسے ہی پوچھا تھا۔''

اتنا کہہ کر شارک مچھلی شہری باہر گیا۔دفتر کے باہر سیڑھیوں پر ایک عدد تربوز پڑا تھا۔جو جسامت میں کسی ہاتھی کے بچے سے کم نہیں تھا۔شارک مچھلی شہری نے چپڑاسی اور دو مزدوروں کی مدد سے اٹھا کر تربوز کو دفتر کے اندر پہنچایا۔

تربوز کو دیکھ کر ملک جوئندہ اور خدا بخش گھگہ اٹھ کھڑے ہو گئے۔تربوز نے کمرے کے تیسرے حصہ کو قبضہ میں لے لیا۔

''حضور میٹھا ہے یہ تربوز''

شارک مچھلی شہری نے باہر کی ایک دکان سے آدمی منگوا کر تربوز کو تھوڑا سا کاٹا۔سرخ سرخ تربوز بڑا لذیذ تھا۔ملک صاحب اور گھگھ صاحب تربوز کی قاشیں کھانے لگے۔قاشیں اتنی بڑی تھیں کہ جب وہ قاش منہ کے پاس لاتے تو ان کے منہ چھپ جاتے۔ شارک مچھلی شہری نے فلمی کہانی شروع کی:

''حضور!عرض کیا ہے کہ صبح کا سماں ہے نور کا تڑکا ابھی ابھی لگا ہے اور گھی جلنے کی بو آ رہی ہے۔فطرت جانماز پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی ہے۔آسمان پر اکادکا ستارے اچکن کے بٹنوں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔پرندوں کی زبانیں صبح کے خیر مقدم میں قینچی کی طرح چل رہی ہیں۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گھاس پر استری پھیر رہی ہے۔''

ملک جوئندہ نے قطع کلامی کر کے پوچھا:

''شارک صاحب! آپ درزی تو نہیں ہیں۔''

''شارک مچھلی شہری نے کہا:''

''جی نہیں میں ٹیلر ماشٹر .... ہاں حضور.......۔

تو عرض کیا ہے کہ نور کا تڑکا ہے۔ صبح کو بھینی بھینی ہوا چل رہی ہے۔ ایک گائے گھاس چر رہی ہے.......۔''

گھگھ صاحب گردن کھجلانے لگے۔

''شارک صاحب کہانی شروع کہاں سے ہوتی ہے۔ ایکشن کہاں ہے!''

''ابھی آتا ہے حضور۔ گائے گھاس چر رہی ہے۔ اچانک ایک آدمی چہرے پر نقاب ڈالے ادھر ادھر دیکھتا نمودار ہوتا ہے اور بھاگ کر گائے کی ٹانگوں میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کا دودھ پینے لگتا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ دس آنے والی کلاس سے ایک آدمی آواز لگاتا ہے۔ اوئے ماں کا دودھ پی رہے ہو۔ فرسٹ کلاس والے قہقہے لگاتے ہیں۔ ہال میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور فلم کی سلور جوبلی کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو حضور آگے عرض کیا ہے کہ وہ آدمی گائے کا دودھ پی کر جیب سے ریشمی رومال نکال کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ لوگوں کی طرف منہ کر کے آنکھ مارتا ہے اور ایک دم بھاگ جاتا ہے اور حضور تربوز میٹھا تھا نا۔

حضور اس کہانی کو چھوڑیئے۔ کیا عرض کروں ہمارے ماموں کے باغ میں اس سے بھی بڑے بڑے تربوز پائے جاتے ہیں۔ حضور غدر کے زمانہ میں ہمارے نانا جان نے ایک تربوز کے پیچھے بیٹھ کر اسے مورچہ بنا کر انگریزوں پر دور دور تک گولیاں چلائی تھیں۔ تو عرض کیا ہے کہ حضور کہ دوسرا اسین سامنے آتا ہے۔ سنیما ہال والے کیا دیکھتے ہیں۔ کہ پردہ سین پر ایک ریل گاڑی گوجرانوالہ کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ایک ڈبے میں ہیرو سفر کر رہا ہے۔ ٹکٹ چیکر آ کر ہیرو سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ ہیرو کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا ہاتھ پھیلا کر ایک دردانگیز گیت گاتا ہے۔ جس میں اس نے غریب مزدوروں کے جذبات کی عکاسی کی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ رونے لگتے ہیں۔ دس آنے کلاس والے دھوتیاں کھول کر آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں اور آنسوؤں کی وجہ سے بار بار نچوڑتے ہیں۔ فرسٹ کلاس میں بیٹھی ہوئی عورتیں دھاڑیں مار کر رونے لگتی ہیں۔ بچے ان کو روتا دیکھ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ خاوند گھبرا کر سنیما ہال سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے حضور۔ لیکن ذرا تربوز کو نظر میں رکھیے گا۔

ہمارے ماموں کے باغ کے تربوز اتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ ایک بار کاٹنے سے پھر منہ نہیں کھلتا۔تو حضور یہاں آ کر کہانی کا ہیرو ایک ٹرن لیتا ہے اور گانا گاتے ہوئے روتے ہوئے گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دیتا ہے۔دریا میں گرنے سے چھینٹے اڑتے ہیں اور دس آنے کلاس والوں کے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔

یہاں سے ڈیز الوکر کے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مسجد کے مینار پر ایک مجاہد اذان دے رہا ہے۔یہاں سے کٹ کر کے ہم ایک محل میں آتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں کہ شام کا عمل ہے۔ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔فانوس روشن ہیں۔ایک رقاصہ ڈانس کرنے کے بعد اپنی ٹانگوں پر السی کے تیل کی مالش کرا رہی ہے۔مالش کے بعد وہ اٹھ کر ایک ران پر ہاتھ پھیرتی ہے اور پھر غسل خانے کی طرف چل دیتی ہے۔دس آنے والے لوگ چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں۔مگر رقاصہ چلی جاتی ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتی تو حضور تربوز کے بارے میں کیا خیال ہے....... -''اب جوشارک مچھلی نے رجسٹر پر سے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ملک جوئندہ اور خدا بخش کھگہ بے ہوش پڑے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔شارک مچھلی شہری نے دو مزدور منگوا کر تربوز اٹھوا کر ریڑھے پر لادا اور زاروقطار روتا ہوا دوسرے فلم کمپنی کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

◆◆◆

رخصتی کا گیت

الوداع! تم فلمی صنعت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر فیوجی یاما جا رہی ہو۔ خدا ایسے علاقے میں تمہاری حفاظت کرے۔ جس کا نام فیوجی یاما ہے۔ تم نے ایک جاپانی تاجر سے شادی کر لی ہے۔ یقیناً تم نے جاپانی تاجر کو سبز باغ دکھائے ہوں گے۔ وگرنہ وہ کبھی تمہارے جھانسے میں نہ آتا۔ تم اس لکھ پتی سرمایہ دار کے ساتھ فیوجی یاما جا رہی ہو۔ سنا ہے فیوجی یاما میں اس آدمی کا ایک محل ہے۔ وہ کھلونے بنانے والے ایک کارخانے کا مالک ہے۔ تم نے کھلونا سمجھ کر اس سے شادی کی ہے اور کھلونا سمجھ کر ایک دن تمہیں چھوڑ دے گا۔

یہ کھلونوں کا کھیل بڑا دلچسپ ہوتا ہے تم یہاں نہیں ہوگی تو یہ کھیل بڑا یاد آئے گا۔ تم ماضی کی حسین یادوں کو سینے کے بالوں میں چھپائے لئے جا رہی ہو۔ فیوجی یاما کے محل میں اپنے جاپانی فیوجی شوہر کو گھٹنوں پر بٹھا کے تم پہروں یادوں کی یاد میں ڈوبی رہو گی۔

تمہیں خیال آئے گا۔ حسین لمحات کا جب پہلے پہل تم برقع اوڑھ کر ایک گراموفون کمپنی کے دفتر میں نعت کا ریکارڈ بھروانے آئی تھیں۔ تم نے بالوں کو کس کر چٹیا گوندھ رکھی تھی۔ ڈوپٹہ برقعے کے اندر بھی سر کے اوپر کر رکھا تھا۔ تم نے ڈرتے ڈرتے کانپتے ریکارڈ بھروایا تھا۔

لیکن تمہارے ابا جی تمہارا حوصلہ بڑھاتے رہے تھے۔ تمہارے ابا جی نے ہمیشہ تمہاری حوصلہ افزائی کی ہے۔ حقیقت میں تمہارے فن کی تمام خوبیاں اور تمہارے گداز جسم کے سارے کمالات تمہارے ابا جی کی چشم پوشیوں اور مہربانیوں کے مرہون منت ہیں۔

پھر جب پہلے پہل گراموفون کمپنی کے پروگرام ڈائریکٹر نے ایک دن ویٹنگ روم میں تمہارا بوسہ لیا تھا تو تم چھوئی موئی بن گئی تھیں۔ جس طرح کہ عام گھرانے کی لڑکیاں چھوئی موئی بن جایا کرتی ہیں۔ مگر اس وقت تم فیوجی یاما نہیں ہوئی۔

یہاں سے ترقی کر کے تم نے برقع اتار کر اپنے ابا جی کو دے دیا۔ جنہوں نے اسے اپنی پگڑی میں لپیٹ کر گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں چھپا دیا۔ جہاں وہ پھر کبھی نہیں گئے۔

آج تم ایک کھلونے بنانے والے جاپانی کی مشین بن کر فیوجی یاما جا رہی ہو۔ تو اے ملک کی فلمی صنعت کی مایہ ناز اداکارہ تمہارے پرستار تمہارے برقعے اور تمہارے اباجی کی پگڑی کو یاد کر کے بہت کچھ سوچا کریں گے۔

آہ! میں رومانٹک ہو رہا ہوں۔ اب میرے قلم میں سے ستارے جھڑیں گے۔ میرا حلق خشک ہونے لگا ہے اور سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں جب رومانٹک ہوتا ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دل چاہتا کہ کسی عورت سے بھاگ کر لپٹ جاؤں اور اگر سامنے کوئی عورت نظر نہ آئے تو کسی درخت سے بغلگیر ہو جاؤں۔

آہ! چاندنی رات ہے ستارے بکھر رہے ہیں۔ چاند مسواک کر رہا ہے۔ رات کی دلہن چاند کے شبہ بالے کو گود میں بھلائے اپنے سسرال چلی جا رہی ہے۔ جس طرح تم اپنے کھلونے کو لئے فیوجی یاما جا رہی ہو۔

جب تمہیں تنہائی میسر آئے گی اور تنہائی مصروفیات سے فراغت حاصل ہو گی۔ تم اپنی پنڈلیوں کے بالوں پر انگلیاں پھیر کر ان دنوں کی یاد میں کھو جاؤ گی۔ جب تم برقع اوڑھ کر اپنے اباجی کے ساتھ گراموں کمپنی کے دفتر میں ریکارڈ بھروانے جایا کرتی تھیں اور پروگرام دینے والے تمہارے جسم کی ابھری ہوئی فیوجی یاما کی چوٹیوں کو گھورا کرتے تھے۔ ہر آدمی کی یہی خواہش ہوا کرتی کہ وہ ان چوٹیوں پر جا کر آباد ہو جائے اور ساری عمر اللہ اللہ کر کے گزار دے۔

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ فیوجی یاماں کی چوٹیاں ان دنوں بڑی دلکش ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں تو ہر آدمی ان چوٹیوں پر بھکشو بن کر آباد ہونے کو تیار تھا۔ اصل میں تمہارا جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اگرچہ تمہاری آواز باریک تھی۔ جب گراموں کمپنی والوں نے تمہاری آواز سنی تو انہیں ناامیدی ہوئی۔ جب انہوں نے کپڑوں میں پھنسا تمہارا گداز جسم دیکھا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں اور رال بہنے لگی۔ انہوں نے تمہاری بدن کے نشیب و فراز گنتے ہوئے تمہاری آواز پر واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ ایک نے کہا۔

''ملک کو جس فنکارہ کی ضرورت تھی وہ پیدا ہو گئی ہے....... فلم انڈسٹری کا چاند طلوع ہو گیا ہے۔ فلم صنعت کے آسمان پر ایک اور دمدار ستارا ابھر آیا ہے۔''

جب تم چلی گئی تھیں تو اس آدمی کو دوسرے نے پوچھا:

''ملک کو جس فنکارہ کی ضرورت تھی یا ہمیں جس فنکارہ کی ضرورت ہے۔

وہ پیدا ہو گئی ہے۔

اس نے آنکھ مار کر کہا:

''مطلب یہی تھا۔''

تمہارے اباجی نے تمہیں آرٹ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور تم نے اپنے آپ کو آرٹ کے پرستاروں کے حوالے کر دیا۔ تمہاری شادی، جب تم برقع پہنتی تھیں، تمہارے ہی محلے کے ایک کلرک سے ہونے والی تھی۔ جس کی تنخواہ 60 روپے مہنگائی الاؤنس اور پانچ روپے سال کی ترقی کل 150 روپے تھی۔ لیکن جب تم فنکارہ بن گئیں تو کلرک اپنے مہنگائی الاؤنس کے ساتھ اپنی سائیکل پر سوار بہت پیچھے رہ گیا اور تم آرٹ کی خدمت کرتیں۔ اپنے پروڈیوسر کی جیب میں ہاتھ ڈالے بہت دور نکل گئیں۔

الوداع! آج تم فیوجی یاما جارہی ہو۔ تمہاری منزل یاما ہی تھی۔ اب تم نے تن من دھن سے آرٹ کی خدمت شروع کر دی۔ تم گھر پر ہوتیں، کاریں ہوتیں، صوفے پر ہوتیں۔ سٹوڈیو کے پیچھے ہوتیں۔ یا غسل خانے میں ہوتیں آرٹ کی خدمت سے کبھی باز نہ رہ جتیں۔ آرٹ بھوت بن کر تمہیں چمٹ گیا تھا اور تم بھوتنی بن کر آرٹ کے نام پر روپیہ بہانے والوں سے چمٹ گئی تھیں۔ تم نے بال کٹوا لئے سینہ اوپر اٹھوا لیا بھنویں ترشوا لیں۔ تمہارے پیارے اباجی نے بھی مونچھیں منڈوا لیں۔ تم نے پروڈیوسروں کی جیبوں اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ جما لیا۔

آہ! آج میں پھر رومانٹک ہو رہا ہوں۔ چاند میرے سامنے آہستہ آہستہ اپنے کپڑے اتار رہا ہے۔ چاندنی منہ پر ہاتھ رکھے اپنی کھانسی روکے کھڑی ہے۔

گوبھی کا ایک درخت حلوہ کدو کا سنہری پھول لٹکائے اونگھ رہا ہے اور کبھی کبھی حلوے کدو پر ہاتھ بھی پھیر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کبھی کبھی آرٹ کے شیدائی تمہارے شانوں پر ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے۔ اور میں اپنا سر دھن رہا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاپانی کھلونوں کے تاجر کو گود میں اٹھا کے فیوجی یاما جارہی ہو۔ اب میں کس کے دستر خوان پر بیٹھوں گا۔ کس کی کار کا دروازہ کھولوں گا؟ کس کی تعریف میں مضمون لکھوں گا کس کے اباجی کی مونچھوں پر عطر لگایا کروں گا۔ کس کا پرس اور کوٹ تھام کر سٹوڈیو کے باہر کھڑا رہا کروں گا۔

تم سہاگ کی رات فیوجی یاما میں بسر کرو گی۔ سہاگ کی رات کو وہ تمہیں تمام راتیں یاد آئیں گی۔ جو تم نے آرٹ کی خدمت میں گزار دیں۔ وہ راتیں جنہوں نے تمہارے اباجی کے دنوں کو روشن کر دیا۔ جنہوں نے تمہارے ہونے والے کلرک خاوند سے تمہیں چھین لیا۔

تم جارہی ہو۔ فیوجی یاما کے جاپانی کھلونوں کے تاج پر سارا سال جمی رہا کروگی جب تک کہ وہ کوئی دوسرا کھلونا ایجاد نہیں کر لیتا اور جب کہ تمہارا اس کھلونے سے جی نہیں بھر جاتا۔

اگر آج تم اس سائیکل سوار کلرک کی بیوی ہوتیں تو تمہارے سر پر ڈوپٹہ ہوتا۔ تمہارے بچے جانماز پر بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے۔ تم ان کے لئے مشین پر کپڑے سیا کرتیں۔ رات کو اپنے خاوند کے لئے کھانا تیار کرتیں اور اس کے پاؤں دابتیں۔ پھر تمہیں سوائے دو تین محلہ داروں کے اور رشتہ داروں کے اور کوئی نہ جانتا۔ لیکن تم بیوی ہوتیں۔ وہ عورت جسے جب تک کوئی نہیں جانتا وہ اپنے مقام پر روشنی کا مینار بن کر چمکتی ہے اور جب اسے کوئی جاننے لگتا ہے تو وہ روشنی کا مینار بجھ جاتا ہے۔ پھر وہ چمنی سے نکلتا ہوا دھواں بن جاتی ہے۔

تم بھی چمنی کا دھواں ہو۔ تم علی بابا کی وہ غار ہو۔ جہاں کی دولت سب لوٹ کر لے گئے ہیں اور جہاں اب سوائے قاسم کی لاش کے اور کچھ نہیں۔

آہ! میں پھر رومانٹک ہو رہا ہوں۔ گوبھی کے درخت پر حلوہ کے سنہری پھول.......

چاند....... پھر کپڑے اتارنے لگا ہے....... آہ! میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ بال کھڑے ہو رہے ہیں۔ آہ! گوبھی کا درخت! حلوہ کدو کے سنہری پھول۔

◆◆◆

کامیڈی کی ٹریجڈی

ماسٹر قریشی کامیڈین فلمی حلقوں میں اپنی ظریفانہ طبیعت نازک چٹکلوں اور ہنسوڑ مزاج کی وجہ سے اور غیر ملکی حلقوں میں اپنی اداکاری کے لئے بہت مقبول تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جدھر سے گزر جاتا لوگ نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے اور ہاتھ ملانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر قریشی کی فلمی حلقوں کا یہ عالم تھا کہ شوٹنگ کے دوران اگر تھوڑا سا وقفہ مل جاتا تو اس کے ساتھی اداکار اور اداکارائیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں اور اس کے برجستہ جملوں' شگفتہ مذاق اور ہلکے پھلکے گیتوں سے لطف اندوز ہوتیں۔ ماسٹر قریشی گانے میں بڑا سریلا تھا۔ قدرت نے اسے بڑا پرسوز گلا عطا کیا تھا۔

ماسٹر صاحب کے پاس بیک وقت درجن درجن بھر فلموں ہوتیں۔ جن میں وہ کامیڈین کا رول کر رہے ہوتے۔ انہیں سر کھجلانے کی فرصت نہ ہوتی۔ ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کی طرف ٹیکسی انہیں بھگائے لئے پھرتی۔

لیکن آج سے چھ سات سال پہلے ماسٹر صاحب یہ یہ حالت نہ تھی ان دنوں وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ شہر کے اندرون ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ جہاں وہ اپنے دو تین شاگردوں کے ساتھ بیٹھے صبح سے شام تک کپڑے سیا کرتے تھے۔ محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ بڑے شریف' قانع اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ شام کو وہ گھر جا کر اپنے بیوی بچوں میں بیٹھ کر روٹی کھاتے۔ ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے۔ انہیں نقلیں کر کے ہنساتے۔ ان کی توتلی زبان سے باتیں سن سن کر خوش ہوتے۔ بیوی کی بھی خبر گری کرتے۔ جمعہ کو چھٹی کرتے اور دکان کے اندر اپنے دوستوں کے ساتھ ڈھولک اور ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے۔ چائے بازار سے آ جاتی۔ رات گئے تک گانے بجانے کی چھوٹی سی محفل سی لگی رہتی۔ ماسٹر صاحب اپنے دوستوں کو کبھی مسخرہ بن کر کبھی بادشاہ کا پارٹ کر کے دکھاتے کیونکہ انہیں گانے کے علاوہ فلم میں اداکاری کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ فلم وہ ہر دوسرے تیسرے روز سینما میں جا کر دیکھتے۔

آہستہ آہستہ انہوں نے کوشش کر کے ایک فلم میں لباس بنانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ انہیں کافی فائدہ ہوا۔ مگر اصلی فائدہ یہ ہوا کہ وہ

فلمی دنیا سے متعارف ہو گئے۔ انہوں نے فلم ڈائریکٹر کو اپنے گانے ڈانس اور مزاحیہ حرکتوں سے اس بات پر قائل کرلیا کہ اگر انہیں فلم میں چانس دیا گیا تو وہ بڑے کامیاب ثابت ہوں گے۔

چنانچہ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد انہیں ایک فلم میں کام مل گیا۔ پہلی ہی فلم میں کامیابی نے ان کے قدم چوم لئے۔ وہ راتوں رات مشہور ہو گئے اور لوگوں نے انہیں بطور کامیڈین قبول کرلیا۔ اب انہیں دو تین مزید فلموں میں کام مل گیا۔ ان ساری فلموں میں انہوں نے اس خوبی سے کامیڈین کا رول نبھایا کہ فلمی دنیا میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے کامیڈین ایکٹروں کو اپنے مستقبل کی فکر پڑ گئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ماسٹر قریشی میدان عمل میں کود چکے تھے۔ ان پر شہرت اور دولت کے دروازے کھل چکے تھے۔ انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

پہلی فلم میں انہوں نے پانچ سو روپے کے قلیل معاوضے پر کام کیا تھا۔ دوسری فلم میں انہوں نے ایک ہزار روپیہ لیا اور جب ان کی ہر فلم ہٹ ہونے لگی تو ان کا بھاؤ بڑھتے بڑھتے پانچ سے آٹھ ہزار اور پھر دس ہزار تک پہنچ گیا۔ انہوں نے شہر کے اندر اپنی درزی کی دکان بند کی' شاگردوں کو چھٹی دی اور شہر سے باہر ایک خوبصورت کوٹھی لے کر رہنے لگے۔ اب تو ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ گھر میں ریڈیو گرام آ گیا تھا۔ جہاں پہلے گراموفون بھی نہیں ہوتا تھا۔

الماریوں میں تانبے اور مٹی اور برتنوں کی جگہ چینی کے ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ آ گئے۔ انہوں نے ایک گاڑی بھی خرید لی کتنے ہی گرم سوٹ بنوائے۔ بیوی کی بھی کایا پلٹ گئی۔ اس کے پاس بھی قیمتی کپڑوں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔ یہ کنبہ جو کل تک شہر کی ایک چھوٹی سی گلی میں روکھی سوکھی روٹی کھا کر خدا کا شکر ادا کر کے گزارہ کر رہا تھا۔ اب ایک شاندار کوٹھی میں اعلیٰ کھانے کھانے لگا۔

بیوی اس خوشگوار انقلاب پر خوش تھی۔ انہیں اگر کوئی غم تھا تو صرف اتنا کہ ماسٹر صاحب نے چائے چھوڑ کر اب شراب پینی شروع کر دی تھی۔ شروع شروع میں تو صرف شام کے وقت تھوڑی سی پی لیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے دن کے وقت بھی پینی شروع کر دی۔ پھر عالم یہ ہو گیا کہ دن بھر نشے میں رہنے لگے۔ بیوی کو یہی کہتے تھے۔ کہ تھوڑی پیتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ زیادہ کام کی وجہ سے انہیں تھکاوٹ ہو جاتی ہے اور اس تکان کو صرف شراب ہی دور کر سکتی ہے۔

کیا کروں بیگم آخر روپیہ بھی تو کمانا ہوتا ہے۔ ایسا نہ کروں تو گھر کا اتنا سارا خرچ کیسے چلے۔ دو سو روپے تو کوٹھی کا کرایہ ہی ہے۔

پھر گاڑی کا خرچ ہے۔

ڈرائیور کی تنخواہ ہے نوکر ہیں۔

بیوی چیکی ہورہتیں۔ ماسٹر صاحب شراب میں دن بدن غرق ہوتے گئے۔ شراب ان پر سوار ہوگئی۔ شراب نہ پئیں تو بدن چلنے پھرنے اور دماغ کام کرنے سے انکار کردیتا۔ چونکہ وہ بڑے کامیاب کامیڈین تھے۔ اس لئے پروڈیوسروں کو مجبوراً ان سے کام کروانے انہیں پلے سے شراب پلانی پڑتی تھی۔ پروڈکشن کی گاڑی انہیں گھر سے لے جانے آتی تو ماسٹر صاحب گھر سے سٹوڈیو تک آدھی بوتل شراب خالی کردیتے اور جی لڑا کر کام کرتے۔

ان کی فلمیں دھڑا دھڑ کامیاب ہورہی تھیں۔ لیکن ماسٹر صاحب کی صحت گرنے لگی تھیں۔ وہ دبلے ہوگئے تھے۔ جگر میں درد رہنے لگا تھا۔ آنکھیں کمزور ہورہی تھیں۔ دل کے دورے پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ انہوں نے کھانا پینا بھی بے حد کم کردیا تھا۔ کھانے کی جگہ شراب پیتے اور جب تھک جاتے تو مزید شراب کی تلاش میں نکل جاتے۔

آہستہ آہستہ عالم یہ ہوگیا کہ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں دھت رہنے لگے۔ اب انہوں نے فلمی کاموں میں بھی تغافل برتنا شروع کردیا۔ انہیں شوٹنگ کی تاریخیں بھی یاد نہ رہتیں۔ پروڈیوسر گاڑی بھیجتا تو ماسٹر شراب کے نشے میں دھت ڈرائیور کو گالیاں دینا شروع کردیتے۔

پروڈیوسر تنگ آگئے۔ ان کے لاکھوں روپے خرچ ہورہے تھے۔ وہ یہ کس طرح گوارا کرسکتے تھے کہ ماسٹر صاحب ہر بار انہیں غنچہ دیئے جائیں۔ اور صرف ان کی وجہ سے انہیں شوٹنگ پیک اپ کرنی پڑے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ پروڈیوسروں نے غنڈوں کی خدمات حاصل کرلیں۔ غنڈے اٹھا کر ماسٹر کو سٹوڈیو سے لے جاتے۔ اب ان کی پٹائی بھی ہونے لگی۔۔ ایک بار انہیں اتنا پیٹا گیا کہ ان کے چہرے پر زخموں کے نشان ابھر آئے اور وہ ہسپتال میں دو روز تک پڑے رہے۔

بیوی ان کی دیکھ بھال کرتی اور روتے ہوئے کہتی۔

”یہ کام چھوڑ دیجئے میری مانئے۔ ہم پھر اپنے شہر والے مکان میں چلے جاتے ہیں۔“

لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ گئیں تھیں۔ ماسٹر صاحب کا دماغ ماؤف ہوچکا تھا۔ شراب کی زیادتی اپنا کام کر گئی۔ ان کے پھیپھڑے خراب ہوگئے تھے۔ جگر چھلنی ہوچکا تھا۔ چنانچہ ایک روز صبح صبح ساری فلم انڈسٹری میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ماسٹر صاحب انتقال کرگئے ہیں۔

فلمی اخباروں نے بڑی بڑی سرخیاں لگائیں۔ اداکاروں کی انجمن نے تعزیتی قراردادیں منظور کیں۔ اس کے جنازے پر ہر ایکٹر اپنی کار میں بیٹھ کر آیا اور دو آنسو بہا کر اسی کار پر واپس چلا گیا۔ کئی پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں اور ایکٹروں سے مرحوم کے

پسماندگان کو امدادی رقمیں دینے کا شاندار اعلان کیا۔ اس اعلان پر ان کی بڑی پبلسٹی ہوئی۔

لیکن مرحوم کی بیوی کو ایک پائی بھی نہ ملی۔ وہ بے چاری کوٹھی سے باہر نکال دی گئی اور پھر سے شہر کے اندر ایک کوٹھڑی کرائے پر لے کر بچوں کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر ان کے برتن مانجھ کر بچوں کا پیٹ پالتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔

آخر ایک دردمند دل والے اداکار نے ماسٹر مرحوم کے پسماندگان کی امداد کے لئے ایک ورائٹی شو کا انتظام کر دیا۔ انڈسٹری کے ہر ایکٹر اور ہر ایکٹرس نے تعاون کا یقین دلایا۔ بڑے بڑے پوسٹر شائع کئے گئے۔

جس سینما میں یہ شو ہونے والا تھا اسے خوب سجایا گیا۔ ہزاروں روپیوں کے ٹکٹ بکنے کی توقع تھی۔ کیونکہ لوگ ایکٹرسوں کے دیکھنے کے شوق میں جوق در جوق آئے ہوئے تھے مگر شو کا منیجر اس وقت تک ٹکٹ ایشو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ اداکار ہال کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

چنانچہ یہی ہوا۔ جب شو کا وقت آیا تو سوائے دو ایک معمولی اداکاروں کے اور دو ایک ایکسٹرا ایکٹرسوں کے اور کوئی وہاں نہ پہنچا۔ بڑے بڑے فنکاروں کے فون آنا شروع ہو گئے کہ چونکہ ان کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اس لئے آنے سے معذور ہیں۔ معذرت قبول فرمائی جائے۔

ایک مشہور ایکٹرس جس نے مرحوم کے حق میں دو کالمی بیان دیا تھا فون پر بولیں۔

"منیجر صاحب بڑا افسوس ہے۔ شوٹنگ کا وقت تبدیل نہیں ہو سکا۔

بتایئے میں کیسے آسکتی ہوں۔ معافی مانگتی ہوں۔ سخت شرمندہ ہوں۔ بائی بائی۔"

چنانچہ جب وقت ہو گیا اور ایک بھی دردمند فنکار مرحوم کی امداد کو نہ پہنچا تو لوگوں نے جو باہر ہال میں جمع تھے۔ شور مچانا شروع کر دیا۔ انہوں نے باہر لگے ہوئے پوسٹر اتار کر پھینک دیئے۔ جھنڈیاں تار تار کر دیں۔ گیٹ توڑ دیا۔ گملے اٹھا کر سڑک پر پھینکنے شروع کر دیئے۔ جب طوفان تھم گیا۔ لوگ چلے گئے تو منیجر گنجے سر پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے ارد گرد سوائے ان پھٹے ہوئے اشتہاروں کے اور کچھ نہ تھا جن پر لکھا تھا۔

"مرحوم ماسٹر قریشی کے پسماندگان کی امداد کے لئے فنکاروں کا ورائٹی شو۔

فنکار کبھی نہیں مر سکتا۔"

فن کار واقعی مر کر بھی نہیں مرا کرتا۔ لیکن اس ملک میں اس کے پسماندگان زندہ رہ کر بھی زندہ کہلوانے کے قابل نہیں ہوتے۔

◆◆◆

ڈرامہ سسی پنوں جدید

گل پہلوان کے تھیٹر میں آج بڑی چہل پہل ہے اور کیوں نہ ہو۔ آج یہاں کمپنی کا نیا کھیل ہونے والا ہے۔ اس کھیل کا نام سسی پنوں ہے۔ اس میں ماسٹر بچو رریڈیو سنگر اور مس چنچل ریڈیو سنگر ہیرو ہیروئن کا کام کررہے ہیں۔ پنڈال میں گڑھا کھود کر دری بچھادی گئی ہے۔ کچھ لمبے بنچ اور چارپائیاں بھی ڈال دی گئی ہیں۔ کھیل شروع ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔ پنڈال کے دروازے پر ڈھول پیٹا جارہا ہے۔ ایک مسخرہ مچان پر ناچ رہا ہے۔ ایک آدمی صندوقچی پاس رکھے دھڑادھڑ ایک ایک آنے کے ٹکٹ فروخت کر رہا ہے۔ دری پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بنچوں اور چارپائیوں پر لوگ بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہیں۔ ماسٹر بچو ڈائریکٹر شہابو نے محض اس لئے ہیرو کا پارٹ دیا ہے۔ کیونکہ ماسٹر بچو ڈائریکٹر کے بچوں کو دو سال تک کھلاتا رہا ہے۔ اس کے گھر کا سودا لاتا رہا ہے اور ہر روز اس کی مالش کرتا رہا ہے۔

مس چنچل تو شہابو کی خاص منظور نظر ہے۔ مس چنچل تھیٹروں کی مشہور اداکارہ ہے۔ وہ گنجی ہے مگر گھوڑے کے بالوں کی وگ لگاتی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے۔ بے شمار مرد جنہوں نے عورتوں کا لباس پہن رکھا ہے گھوڑے کے لمبے لمبے بال لگائے ہوئے ہیں۔ چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا ہے۔ حمد گاتے نظر آتے ہیں۔

تو داتا....... تو داتا

سب کا پالنہار ہار....... سلامت پر دا گرتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو سامنے بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے۔ لنڈے سے خریدی ہوئی کسی مرحوم شکاری کی پرانی برجس پہن رکھی ہے۔ پاؤں میں باٹا کے سفید بوٹ ہیں۔ کمر کے ساتھ لکڑی کی تلوار بندھی ہے۔ گلے میں سبز منکوں کی مالا ہے۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ وزیر اعظم ساٹن کا پاجامہ اور پشاوری چپل پہنے اندر آتا ہے اور ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے۔

وزیر: مبارک ہو بادشاہ سلامت۔ خدا نے آپ کو لڑکی عطا کی ہے اور شہزادی صاحبہ کی پیدائش پر رعایا کی طرف سے آپ کو مبارکبادیوں کا گلدستہ پیش کیا جاتا ہے۔

بادشاہ:وزیر صاحب میں اپنی رعایا سے بہت خوش ہوں۔گل مجھے دیئے جائیں اوردستہ رعایا کو واپس کر دیا جائے۔

ہاں!ذرا نجومی کو بلایا جائے۔

وزیر: نجومی حاضر ہے

ایک بوڑھا کھوسٹ نجومی جس کا سر ہل رہا ہے اندر داخل ہو کر آداب بجالاتا ہے۔

بادشاہ: نجومی صاحب یہ بتایئے کہ شہزادی کا ستارا کیا کہتا ہے۔

نجومی: حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں

بادشاہ!ہاں ہاں....... اے نجومی تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے حال جو کچھ ہے سچ سچ بیان کر۔سوچنے سے پہلے سب سود وزیان کر۔

نجومی: بادشاہ سلامت اس لڑکی کی ریکھا یہ کہتی ہے کہ بڑی ہو کر یہ کرے گی۔گرم بازار عشق کا اور پہنے گی گلے میں اپنے یہ ہار عشق کا۔ دنیا میں لوگ اس کے قصے سنائیں گے۔دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آئیں گے۔

بادشاہ: بس بس۔ایسی لڑکی کو جوان ہونے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیا جائے۔لکڑی کا صندوق فوراً تیار کیا جائے۔اس میں اس کو ڈال دیا جائے۔

وزیر: بادشاہ سلامت کچھ اور سوچا جائے۔

بادشاہ: میرا حکم اٹل ہے۔

نجومی: تو پھر شہزادی کی آئی اجل ہے۔

بادشاہ: پردہ گرایا جائے۔

اس حکم کے ساتھ ہی پردہ بڑی مشکل سے گرتا ہے۔گردوغبار کا ایک طوفان اٹھتا ہے۔اس کے ساتھ لوگ بھی اٹھتے ہیں۔گرد بیٹھتا ہے تو لوگ بھی بیٹھ جاتے ہیں۔دوسرا ڈراپ سین شروع ہوتا ہے۔دو ترکھان لکڑی کا صندوق بنا رہے ہیں۔

قائم: دائم دین جلدی جلدی صندوق بناؤ۔تاکہ ہم بھی اس بک بک سے نجات حاصل کریں۔

دائم: لو بھائی صندوق تیار ہو گیا۔آؤ اب شہزادی کو دریا میں پھینک آئیں۔

قائم: جا تیرا خدا حافظ:

دام: اخاہ! لو بھائی قائم۔ اس دھوبی نے صندوق پکڑ لیا۔ لڑکی کے ساتھ دولت بھی پائی ہے۔

قائم: بھائی دائم۔ یہ سب قسمتوں کے چکر ہیں۔ جب تقدیر دن پھیرتی ہے کسی رنجور کے تو ہو جاتے ہیں کچے بیر بھی گچھے انگور کے۔

پردہ گرتا ہے۔

اب سسی اس دھوبی کے ہاں پرورش پاتی ہے اور جوان ہو جاتی ہے ایک دن ایک سہیلی اسے پنوں کی تصویر دکھاتی ہے۔ سسی جو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ ہزار جان سے پنوں پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اب وہ ہر روز تصویر کی پوجا کرتی ہے۔ ایک روز ڈائریکٹر شہابو کی ہدایت کے مطابق ماسٹر بچو یعنی پنوں جو کہ ایک شہزادہ ہے اپنے سپاہیوں کے ساتھ شکار کرتے کرتے سسی کے لاچی باغ کی طرف آتا ہے۔ سسی اسے دور سے دیکھتی ہے۔

سسی: ہیں! یہ تو میرے پنوں کی تصویر اسی کی زنجیر۔! پھر سپاہیوں کو روک کر کہتی ہے:

سسی: ٹھہرو۔ تم اس طرح کھلم کھلا میرے باغ میں آنے والے کون ہو؟

پنوں: اے معزز خاتون میں کیچ کا شہزادہ ہوں اور میرا نام پنوں ہے۔

سسی: پنوں! میرے خوابوں کی تفسیر پنوں۔ میری لکیر کا فقیر پنوں! خوش ہو۔ خوش ہو۔

سسی کہ آج تیرے باغ میں بہار آئی، کر سجدہ کہ تیری دلدار آئی۔

پنوں: (پگڑی زمین پر مار کر) ہیں؟ تو ہے سسی! میری میٹھی لسی۔

سسی: ہاں تیری جان سسی۔

پنوں: لاکھوں کروڑوں شکر ہے اس پروردگار کا جس نے یہ دن دکھایا بہار کا۔

سسی: پیارے پنوں! تو سفر کا تھکا ہارا ہے۔ ذرا آرام کر لے۔

پنوں: پیاری سسی میری راحت تیرا دیدار۔ میرا آرام تیری میٹھی گفتار۔

سسی: تو پھر کیوں نہ ایک دوگانہ گا لیں۔

پنوں: بسم اللہ کیجئے۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گاتے ہیں۔

تیری ذات ہے اکبری سروری
میری پار کیوں دیر اتنی کری

پردہ گرتا ہے

پردہ اٹھتا ہے

پنوں اور سسی رات کو واد عیش دے کر آرام کر رہے ہوتے ہیں کہ پنوں کو بادشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سپاہی اسے مدہوشی کے عالم میں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ سسی کو ہوش آتا ہے تو وہ بستر خالی پا کر پنوں کی جدائی میں یوں روتی ہے۔

سسی: ہائے میرا پنوں۔ میرا میاں چنوں چلا گیا۔ اب میں بھی اپنے سینے میں مار کٹائی مرتی ہوں۔

ماں: صبر کر بیٹی۔

سسی: صبر! آہ صبر عاشقوں کے لئے حرام ہے۔ صبر عشق کا غلام ہے۔ حکم کا غلام ہے۔ اب جان تلی پر رکھ کر میں بھی پنوں کے پیچھے جاؤں گی۔ جنگل میں لیلیٰ ہوتی ہے۔ میں تھاں شہید کہلاؤں گی!

دوسری طرف پنوں کو ہوش آتا ہے تو وہ حیران ہو کر چاروں طرف آنکھیں مل مل کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

پنوں: ہیں اے کہہ گل اور یت کے تھل۔ میں کہاں میری سسی کہاں!

تم کون ہو۔

سپاہی: حضور ہم آپ کے غلام ہیں۔ ہمیں بادشاہ سلامت نے آپ کو لانے کے لئے بھیجا ہے۔ بادشاہ سلامت آپ کی جدائی میں بے چین اور بے قرار ہیں۔

پنوں: نہیں نہیں....... میں اپنی سسی کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔

سپاہی: حضور اب آپ کو سسی کو بھلانا پڑے گا اور ہمارے ساتھ جانا پڑے گا۔

پنوں: ہرگز نہیں۔ اگر تم نے ضد نہ چھوڑی۔ اس نہیں کے مضمون کی تو مہندی سسی کے پاؤں کو لگے گی تمہارے خون کی۔

سپاہی: (سب یک زبان ہو کر) پکڑ لو پکڑ لو۔

پنوں: لیٹ جاؤ۔

سپاہی: آہ میں مر گیا۔

پنوں: کافر مکار حرامزادے!

عین اسی وقت جب کہ ماسٹر بچو پنوں بنا سپاہیوں کو ڈرا دھمکا رہا ہوتا ہے تو ایک تھانیدار پنڈال میں آتا ہے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر

ماسٹر بچو کو آواز دیتا ہے۔

تھانیدار: اوے بچو! کیا بک بک کر رہا ہے۔

ماسٹر بچو عرف پنوں فوراً ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے!

پنوں: نوکر ہیں شاہ جی!

اور پھر اپنے پارٹ میں لگ جاتا ہے۔ پنوں لکڑی کی تلوار کے ایک وار سے سپاہی کو زخمی کرتا ہے۔ زخمی سپاہی ماہی وبے آب کی طرح تڑپتا ہے اور چیخ مار کر کہتا ہے۔

سپاہی: آہ مار ڈالا۔ پہلے شہابو نے پیسے نہ دے کر مارا تھا۔

اب ظالم بچو تو نے مار ڈالا۔

پھر کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیتا ہے۔

جاؤں	تو	جاؤں	کہاں
گاؤں	تو	گاؤں	کہاں

پردہ گرتا ہے۔

آخری سین میں پنوں کو سٹیج پر ایک مصنوعی صحرا میں عربی لباس پہنائے خاک اڑاتے دکھایا جاتا ہے۔ اچانک وہ ایک جگہ قبر پر ایک آدمی کو فاتحہ پڑھتے دیکھتا ہے۔

پنوں: ہیں۔ یہ قبر کس کی اور یہ فاتحہ پڑھنے والا کون! چند روز پہلے تو اس جنگل میں کوئی مزار نہیں تھا۔ کیوں بابا! یہ مزار کس بزرگ کا ہے؟

بابا: اے نوجوان یہ بزرگ کا مزار نہیں بلکہ ایک کنواری لڑکی کی حسرتوں کا مزار ہے۔ جو یہاں پنوں پنوں پکارتی مرگئی۔

پنوں: فاتحہ پڑھنے والے بابا کے سر پر دوہڑ مار کر۔ آہ میری سسی مرگئی۔ آہ!

میری میٹھی لسی بہہ گئی۔ سلام اے بے وفا دنیا تجھے میرا آخری سلام۔

سسی: مت گھبرا۔ تو بہشت میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ میں بھی آرہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی پنوں قبر پر گرتا ہے۔ قبر پھٹتی ہے اور پنوں سٹیج کے نیچے جا گرتا ہے۔ جہاں سسی اس سے پہلے ہی میٹھی مونگ پھلی کھا رہی ہوتی ہے۔ اوپر سٹیج پر وہ عربی لباس والا بابا لوگوں کو

مخاطب کر کے کہتا ہے۔

عربی بابا: ظاہری آنکھ سے دنیا کو دیکھنے والے لوگو! باطنی آنکھ کھول کر دیکھو۔ سچے عاشق معشوق بہشت میں جھولا جھول رہے ہیں!

پردہ گرتا ہے اور حوریں گیت گا رہی ہیں۔

دلا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے

او دلا ٹھہر جا....... ہائے دلا ٹھہر جا.......

پنڈال سے لوگ نکلتے ہیں اور ایک دوسرے کو آوازیں دے کر گا رہے ہیں۔

او دلا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے

اوے دلا ٹھہر جا....... -

◆◆◆

گوریلے کا انجام

ہالی وڈ کی فلموں میں زپی نامی گوریلا نے تہلکہ مچا دیا۔اس نے ہر فلم میں اپنی اداکاری سے بڑے بڑے ایکٹروں کو مات دے دی۔زپی گوریلا کی موجودگی فلم کی کامیابی کی کلید تھی۔جس فلم میں یہ گوریلا ہوتا وہ ہفتوں رش لیتی اور پروڈیوسر لاکھوں میں کھیلنے لگتا۔
لاہور کے فلمی حلقوں میں نادر گوریلا کی کامیابی اور اہمیت پر عام گفتگو شروع ہوگئی۔جسے دیکھو ہالی وڈ کے گوریلا کے گن گارہا ہے۔

"اجی اگر وہ گوریلا یہاں آجائے تو بڑے بڑے ایکٹروں کو فرش کر کے رکھ دے۔"

"واہ صاحب واہ! سالا کیا کام کرتا ہے۔پاکستان کی فلم انڈسٹری کو اس گوریلا کی انتہائی ضرورت ہے۔"

خدا بخش فلم پروڈیوسر نے زپی گوریلا کی اتنی تعریف سنی تو بہ نفس نفیس اس کی فلم دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔جب وہ فلم دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلا تو اس کے دماغ میں سوائے گوریلا کے کچھ نہ تھا۔خدا بخش پروڈیوسر پاکستان کے ایکٹروں سے تنگ آچکا تھا۔اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس ملک کے ایکٹر سوائے گردنیں موٹی کرنے کے اور توندیں بڑھانے کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔اس نے شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ اس ملک کی فلم انڈسٹری کو موجودہ مالی اور ذہنی بحران سے نجات دلانے کے لئے زپی گوریلے کی سخت ضرورت ہے۔

خدا بخش نے دوسرے ہی روز ہالی وڈ والوں سے زپی گوریلا کی بابت بات چیت شروع کردی۔ہالی وڈ والوں کے لئے زپی گوریلا الہ دین کے چراغ کی حیثیت رکھتا تھا۔وہ اسے کسی صورت سے اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہ ہورہے تھے۔لیکن خدا بخش کے پاس روپیہ تھا لاکھوں روپیہ تھا۔اس نے زپی گوریلا کے مالک کو دس لاکھ روپے کی پیش کش کی۔اس شرط پر کہ زپی خدا بخش کے پاس چار سال رہے گا۔اس کے بعد اس کا مالک گوریلے کو واپس لے سکے گا۔سودا طے ہوگیا اور زپی گوریلا لاس انجلز سے ایک طیارے پر سوار کروا کر پاکستان کی طرف روانہ کردیا گیا۔

خدا بخش اپنے فلم یونٹ کے ساتھ کراچی کے ہوائی اڈے پر زپی گوریلا کے استقبال کے لئے پہلے ہی موجود تھا۔جب گوریلا

ایک ائر ہوسٹس کی گود میں نیلے رنگ کا سوٹ پہنے سرخ ٹائی لگائے ہاتھ میں سگار لئے باہر نکلا تو لوگوں نے خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ زپی گوریلا نے نیاہیٹ فضا میں لہرا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے اسے کار میں بٹھا کر میٹرو پول ہوٹل لے جایا گیا۔ جہاں پہلے ہی سے اس کے لئے ایک خوبصورت کمرہ مخصوص کروایا گیا تھا۔

گوریلا جب لاہور پہنچا تو سٹیشن پر اس کے خیر مقدم کو اخباری نمائندوں کی پوری فوج موجود تھی۔ گوریلا نے مسکرا مسکرا کر ہر اخباری نمائندے کے سوال کا جواب دیا۔ مثلاً اس سے پوچھا گیا۔

سوال: کیا آپ کو کراچی پسند آیا؟

جواب: شہر اگرچھوٹا ہے۔ مگر وہاں کے لوگ بڑے کھلے دل کے مالک ہیں۔ میں نے ان میں اپنی جیسی بہت سی عادتیں پائی ہیں۔ میں تو ان میں بالکل اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

سوال: کیا سفر اچھی طرح کٹا۔

جواب: خاکسار تو سکاچ وسکی پی کر سویا رہا۔ ہاں کبھی کبھی گرد نتھنوں میں گھس کر جگا دیتی تھی۔ آپ کے ہاں گاڑی بڑی تیز چلتی ہے۔ مگر سفر آہستہ آہستہ کٹتا ہے۔

لاہور کی فلم انڈسٹری میں زپی گوریلے کی آمد کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ مہینہ بھر اس کی دعوتیں ہوتی رہیں۔ فلمی دنیا کے ہیرو اور ویلنوں کو فکر دامنگیر ہو گیا۔ کیونکہ زپی نے ایک کانفرنس میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہیرو کے علاوہ ولن کا پارٹ بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ وقت پر ہیرو یا ہیروئن کے باپ کا کردار بھی خوش اسلوبی سے ادا کرے گا۔

خدا بخش نے منشی وحشی جنگلوی سے خاص طور پر ایک کہانی زپی کے لئے لکھوائی اور زپی گوریلے کے ساتھ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے نکل گیا۔ خدا بخش گوریلا کی صفات اور خصوصیات کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ یہ گوریلا تو بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ سیٹ پر چائے کم پیتا تھا۔ اور اس کے ساتھ بھی ایسا آدمی یا عورت نہ آتی تھی جب کے لئے خدا بخش کو وسکی اور کھانے کا بندوبست کرنا پڑتا۔

2- یہ کہ زپی گوریلا ایک بھی ری ٹیک نہیں دیتا تھا۔

3- یہ کہ اسے مکالمے زبانی یاد ہو جاتے تھے۔

4- یہ کہ وہ ایکسٹرا لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور ہیروئن سے یونہی دعا سلام سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔

چھانگا مانگا کے جنگل میں زپی گوریلے نے اس غضب کا کام کیا کہ وہاں کے لوگ بھی عش عش کر اٹھے۔ وہاں کے رکھوالوں نے کہا۔

خدا بخش جی! ہم نے اس جنگل میں کئی ایکٹروں کو کام کرتے دیکھا ہے۔ مگر اس گوریلے سے بڑھ کر اچھا کام آج تک کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔

خدا بخش نے بہت جلد فلم مکمل کر لی اور عید پر ریلیز بھی کر دی۔ فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ لوگ سینما ہال پر ٹوٹ پڑے۔ دو روپے کا ٹکٹ پانچ روپے میں بلیک ہونے لگا۔ خدا بخش کو لاکھوں کا نفع ہوا۔ اس نے ایک نئی کار خرید کر زپی کو لے دی اور ساتھ ہی دوسری فلم کا اعلان کر دیا۔

زپی گوریلے کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ لڑکیاں اسے محبت بھرے خطوط لکھنے لگیں۔ اسے ملک کی حسین ترین لڑکیوں کی طرف سے شادی کے پیغامات وصول ہونے لگے۔ وہ جہاں جاتا لڑکیاں اور اس کے مداح اس کے آٹو لینے کے لئے اس پر ٹوٹ پڑتے۔ لیکن زپی گوریلا اپنی شہرت سے بالکل متاثر نہ ہوا۔ کیونکہ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ہالی وڈ کی فضا میں اپنی شہرت کا چاند چمکتے دیکھا تھا۔

وہ لڑکیوں کو بھی محبت بھرے خطوں کے جواب نہ دیتا بلکہ سیکرٹری سے کہہ کر انہیں ایک لفظ ٹائپ کروا کر بھجوا دیتا۔ اکثر خطوط ردی کی ٹوکری میں پھینکوا دیتا۔ زپی گوریلا بڑا شریف النفس اور اپنے اصول کا گوریلا تھا۔ تو وہ بن مانس مگر حقیقت میں وہ بڑا بھلا مانس تھا۔ اس نے اپنے چند ایک اصول بنا رکھے تھے۔ جس پر وہ سختی سے عمل کرتا تھا۔ ان اصولوں کو اس نے ایک چارٹ پر لکھوا کر اپنی کوٹھی کے کمرے میں لٹکا رکھا تھا۔

اصول مندرجہ ذیل تھے۔

1- صبح چھ بجے اٹھنا اور سیر کرنا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر بھجن گانا۔
2- ایک گھنٹہ ہارمونیم پر ریاض کرنا۔
3- ایک ہزار ڈنٹر لگانا۔
4- ناشتہ کر کے شوٹنگ یا ریہرسل کے لئے چلنے جانا۔
5- پورے ایک بجے لنچ کرنا۔ لنچ سے پہلے تھوڑی سی فرانسیسی وائن پینا تاکہ معدے کا فعل ٹھیک رہے۔
6- لنچ کے بعد ایک گھنٹہ قیلولہ کرنا۔

7- قیلولے کے بعد پھر کام کرنا۔

8- شام کی چائے شیزان میں پینا۔

9- رات کا کھانا کوٹھی پر بالکل اکیلے کھانا اور کھانے کے ساتھ سکاچ وسکی کے دو جام چڑھانا۔

10- رات کو روسی اور فرانسیسی ادب کی کتابیں پڑھنا اور سو جانا۔

11- کسی غیر عورت کی دعوت قبول نہیں کرنا۔

12- کسی پروڈیوسر کی گاڑی میں لفٹ نہیں لینا۔

زپی گوریلا اپنی ان عادات کی وجہ سے فلمی حلقوں میں شریف آدمی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی شہرت اس کے عمدہ کام اور بہترین ذاتی خصوصیات کی وجہ سے چاروانگ میں گونج اٹھی۔ اوپر تلے اس کی تین چار فلمیں کامیاب ہو گئیں۔ بلکہ ان فلموں نے کامیابی کے ساتھ تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کی فلم پر سارا شہر ٹوٹ پڑتا۔ دوسری فلمیں دھڑا دھڑ ناکام ہونا شروع ہو گئیں۔ ملک کے مشہور ہیرو اور ولنوں کی مارکیٹ گرنا شروع ہو گئی۔ خدا بخش کے علاوہ ہر پروڈیوسر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کسی دوسرے کاروبار کے متعلق سوچنے لگا۔

تمام ایکٹروں نے اپنی میٹنگ بلائی اور اپنے مخدوش مستقبل کے متعلق غور و فکر کرنے لگے۔ آخر سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی ایسا حل سوچا جائے جس سے زپی گوریلے کی مارکیٹ ختم ہو جائے۔ کیونکہ اسی بھلے مانس کی وجہ سے ان لوگوں کا رزق اٹھتا جا رہا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گوریلا کو کس طرح مات دی جائے اسے ہلاک کر دینا پاکستان کو دنیا کی نظروں میں بدنام کرنے کے مترادف تھا۔

دنیا کی حسین سے حسین عورت کی طرف گوریلا آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ شراب وہ بہترین پیتا تھا اور خود پیتا تھا۔ پھر یہ مرحلہ کیسے طے ہو؟ آخر ایک بوڑھے اور جہاندیدہ ایکٹر نے چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے کہا:

''صرف ایک شے ایسی ہے جو زپی گوریلے کی بولتی بند کر سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

سب نے ہم زبان ہو کر بے تابی سے پوچھا۔

بوڑھے نے ایکٹنگ سے انگلی اٹھا کر کہا:

''چرس''

''چرس''

''ہاں چرس....... اگر زپی گوریلے کو کسی طرح چرس کی عادت ڈال دی جائے تو سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔''

اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اسے چرس کس طرح پلائی جائے؟

طے ہوا کہ گوریلا کی ایک دعوت کی جائے اور اس دعوت میں اسے ایک چرس کا سگریٹ بنا کر پیش کیا جائے۔

چنانچہ دعوت کا دن زپی گوریلے کی منظوری کے بعد طے ہو گیا۔ دعوت ایک عالی شان ہوٹل میں ہوئی۔ وسکی' وائن' مرغ مچھلی اور جانے کیا کیا کھایا پیا گیا۔

آخر میں جس ایکٹر کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگی تھی وہ زپی گوریلا سے باتیں کرتا۔ اسے چاندنی رات کا نظارہ دکھانے کے بہانے ہوٹل کی پچھلی گیلری میں لے گیا۔ اور موسم کی بوقلمونیوں کی باتیں کرتے کرتے اس نے چرس کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''حضور یہ سگریٹ تو ویسے عام سگریٹ ہے۔ مگر اس میں جو شے بھری ہوئی ہے۔ اسے زندہ دلان لاہور طلسم شاعری کے نام سے اور یہ خاکسار سیر فلک کے نام سے یاد کرتا ہے۔ حاتم طائی نے اسے ایک بار چکھا تھا اور ساری عمر ایک بار پیا دوسری بار پینے کی ہوس ہے کی گردان کرتا مر گیا۔''

زپی گوریلے نے حیرت سے سگریٹ کی طرف دیکھا اور بڑی دلچسپی سے اسے سلگا کر پینے لگا۔ گیلری میں کھڑے کھڑے وہ سارا سگریٹ پی گیا۔ مگر اسے کچھ نہ ہوا۔ ایکٹر کو نا امیدی ہوئی۔ لیکن جونہی زپی گوریلا پارٹی والے ہال میں آیا تو اس کے جسم کے بال ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ڈیلے ایک بار چکرائے' گھومے اور اوپر کو چڑھے پاس بیٹھی ہوئی ہر عورت عریاں ہو کر رقص کرنے لگی۔ دماغ میں افریقہ کے جنگل اور حسین گوریلائیں گھومنے لگیں۔ اسے ہر بات پر ہنسی آنے لگی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر قہقہہ لگا کے ہنس پڑتا۔ پھر اس نے کھانا شروع کیا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ساری رات اپنے بستر پر لیٹا سات آسمانوں کی سیر کرتا رہا اور اسے ہر لمحے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اسے بستر پر سے اٹھا کر چھت کی طرف اچھالتا ہے اور پھر بستر پر گرا دیتا ہے۔ رات کے کسی لمحے وہ بستر پر سے اٹھ کر سر کے بل چلنے لگا اور غسل خانے کے نل کے ساتھ لٹک کر دیر تک قلابازیاں لگاتا رہا۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جنہیں گوریلا ایکٹر بن کر بھول گیا تھا۔ چرس کے سگریٹ نے اس کا ماضی لا کر سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی جنگلی محبوبہ کی یاد میں چھم چھم رونے لگا۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں الٹا لیٹ گیا اور حال کھیلنا شروع کر دیا۔ پھر دھاڑیں مار مار کر ہالی وڈ کی حسین عورتوں کو یاد کرنے لگا۔ پھر اسی عالم میں فرش پر ہی گر کر سو گیا۔

دوسرے روز اس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں لگا جیسے وہ رات بھر جنت کی سیر کر رہا ہو۔ اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

اگرچہ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ شام ہوئی تو گوریلا نے غیر محسوس طور پر اسی سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ اس نے فوراً سیکرٹری سے کہا۔ کہ اس رات والے بوڑھے ایکٹر کو فون کرکے بلایئے۔ گوریلا نے خود اس ایکٹر سے فون پر بات کی اور کہا۔

''طلسم سامری کا ایک پورا پیکٹ روانہ کر دیا جائے۔''

بوڑھے ایکٹر نے خوشی کا نعرہ بلند کیا اور فوراً دو پیکٹ چرس والے سگریٹ زپی گوریلا کو بھجوا دیئے۔ اور ساتھ تاکید کر دی کہ ہر سگریٹ کے ساتھ کم از کم ایک پاؤ برفی کھائی جائے۔ اس سے سیر فلک کا مزا دوگنا ہو جائے گا۔

زپی گوریلا نے باقاعدہ چرس پینا شروع کر دی۔ اس نے سکاچ کی بوتلیں باہر پھینکوا دیں۔ عورتوں کے عشقیہ خطوں کے جواب دینا شروع کر دیئے۔ سر کے بال بڑھا لئے۔ صبح گیارہ بجے تک سویا رہتا۔ جو سیکرٹری پہلے لوگوں کو ضروری خطوط لکھا کرتا تھا۔ اب دن بھر زپی گوریلا کے لئے چرس کے سگریٹ بھرتا رہتا۔ خدا بخش پروڈیوسر کی تو سٹی گم ہو گئی۔ اس نے گوریلا سے چرس کے سگریٹ چھیننے کی کوشش کی تو زپی نے اسے صاف صاف کہہ دیا۔

''خدا بخش! اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تم سے کنٹریکٹ منسوخ کر کے دوسرے پروڈیوسر کے پاس چلا جاؤں گا۔''

خدا بخش سر پکڑ کر رہ گیا۔

ایک سال بعد زپی گوریلا کا حال زبوں قابل دید تھا۔ خدا بخش نے اسے جواب دے دیا تھا۔ اس نے دوسری جگہ کام شروع کر دیا۔ مگر اب وہ بات بات پر ری ٹیک کرواتا۔ مکالمے بھول جاتا' کھانا زیادہ کھاتا۔ چائے کے ستاون کپ پی جاتا۔ کھڑے کھڑے جھومنے لگتا۔ جھولتا جھولتا سو جاتا۔ ہر ایکسٹرا لڑکی سے پیار شروع کر دیتا۔ صرف دس روپے لینے پروڈیوسر کے دروازے پر صبح ہی سے جا کھڑا ہوتا۔

ان باتوں نے زپی کی مارکیٹ ڈاؤن کر دی۔ پروڈیوسروں نے اسے فلموں میں کام دینا بند کر دیا۔ ایسی حالت میں زپی گوریلا کے لئے زندہ رہنا اور چرس پینا مشکل ہو گیا۔ یہ عالم دیکھ کر سیکرٹری نے جھک کر سلام کیا اور پہلے جہاز سے ہالی وڈ روانہ ہو گیا۔

آج کل زپی گوریلا لاہور کے ایک سٹوڈیو میں زندگی کی باقی ماندہ دن پورے کر رہا ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ ہر آدمی کے پاس جا کر ہالی وڈ کی باتیں سناتا ہے۔ اور آخر میں ذرا جھک کر کہتا ہے۔

''مولا! ایک چونی گولی کے لئے مل جائے۔''

◆◆◆

گنجے کی واپسی

پروڈیوسر گنجا لنڈے بازار میں پکوڑے بیچا کرتا تھا۔ یہاں سے ترقی کرتے کرتے اس نے کبابوں کی دکان کھول لی۔ اس کے کباب علاقے بھر میں مشہور ہو گئے۔ علی گنجہ کباب والا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ جب اس کا بزنس مزید ترقی کر گیا تو کسی نے اسے کہا:

''علی گنجا! اگر کسی طرح آپ میکلوڈ روڈ پر دکان لے جائیں تو پھر پاؤ بارہ ہیں۔''

گنجے کی عقل موٹی تھی۔ چنانچہ اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے فوراً میکلوڈ روڈ پر دکان حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ آخر وہ ایک دوست کی وساطت سے کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی دکان پر کباب والا کا بورڈ لگوا دیا اور کام شروع کر دیا۔

کوئی ایک سال کے بعد میکلوڈ روڈ کے فلمی حلقوں میں گنجے کا نام مشہور ہو گیا اور جب کاروبار کافی ترقی کر گیا اور گنجے نے سمن آباد میں ''کباب منزل'' کے نام سے اپنا ایک مکان بھی بنوا لیا اس کے اسی دوست نے اسے مشورہ دیا۔

''دوست اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں ایک فلم کمپنی سٹارٹ کرنی چاہیے۔

کبابوں نے تمہیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں سے فلم کا کاروبار شروع ہوتا ہے۔ تم اتنے مشہور ہو گئے ہو کہ لوگ محض تمہارے نام کی وجہ سے بار بار فلم دیکھنے آئیں گے۔ نیلو اور درپن کو کوئی نہیں پوچھے گا۔''

گنجے کی موٹی عقل میں ایک بار پھر بات آ گئی اور اس نے فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ فلم کیسی بنائے جائے کامیڈی، ٹریجڈی، تاریخی، جادو کی، لڑائی مار کٹائی کی یا جاسوسی۔ اسی مقصد کے لئے گنجے نے شہر کے مشہور فلم اسٹور المعروف ''سٹار فلمی سٹور'' سے رجوع کیا۔ سٹار فلمی سٹور کا دفتر لکشمی چوک ہی میں تھا۔ منیجر نے علی گنجے کی بڑی آؤ بھگت کی اور پوچھا۔

''آپ کس قسم کا سکرپٹ چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں جاسوسی، تاریخی جادوئی، جنگی، رومانٹک اور گھریلو غرض کہ ہر قسم کا سکرپٹ آپ کو مل جائے گا۔''

علی گنجے نے کہا:

’’آپ کو تکلیف تو ہو گی لیکن سارے سکرپٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

منیجر نے سر کھجلا کر کہا۔

’’پورے کا پورا سکرپٹ سنانا تو مشکل ہو گا۔البتہ ہم آپ کو نمونے کے طور پر سکرپٹ کا ایک سین سنوا سکتے ہیں۔‘‘

علی گنجے نے خوشی سے سر ہلا کر کہا۔

منیجر نے گھنٹی بجائی اور چپڑاسی سے کہا کہ وہ مسٹر علی گنجے کو ساتھ والے ڈیپارٹمنٹ میں لے جائے۔یہ ڈیپارٹمنٹ جاسوسی فلموں کا سکرپٹ تھا۔

گنجا کو دروازے کے اندر داخل کر کے چپڑاسی باہر نکل گیا۔گنجا جونہی اندر داخل ہوا اچانک پستول چلنے کی آواز آئی۔اور کسی نے قہقہہ مار کر گنجے کو پیچھے سے آ کر پکڑ لیا۔

’’ہا ہا ہا اب قانون کے پنجے سے نکل کر تو کہیں نہیں جا سکتا۔قانون اندھے کی لاٹھی ہے اور یہ لاٹھی اس کی ہوتی ہے جس کی بھینس ہوتی ہے۔‘‘

گنجے نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

’’لیکن حضور میرا کیا قصور!‘‘

کمرے میں اندھیرا تھا۔اچانک بتی جل۔روشنی میں گنجے نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول ہے اور اس کے سامنے فرش پر ایک لاش خون میں لت پت پڑی ہوئی ہے۔پاس ہی ایک آدمی پولیس کی وردی پہنے کھڑا ہے۔اس آدمی نے کہا۔

’’تو قاتل ہے۔قتل تو نے کیا ہے کیونکہ پستول تیرے ہاتھ میں ہے اور لاش تیرے قدموں میں پڑی ہے۔‘‘

’’لیکن میں تو سکرپٹ۔‘‘

’’ہا ہا ہا سب جانتا ہوں کمینے تو مجھے جل نہیں دے سکتا۔قتل تو نے ہی کیا ہے چلو تھانے۔‘‘

گنجے کو پسینہ آ گیا۔اس کے بعد اچانک ایک آدمی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

’’کیوں جناب اگر آپ کی فلم کا یہ پہلا منظر ہو تو کیسا رہے گا۔‘‘

گنجے نے پسینہ پونچھ کر کہا۔

''مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے۔''

اس کے بعد وہ جاسوسی فلموں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ لیکن ابھی وہ مشکل سے اندر داخل ہی ہوا تھا کہ ایک سیاہ پوش آدمی نے اس کے سر پر ڈنڈا مار کر اسے بکرا بنا دیا۔ اور چنوں سے بھری ہوئی تھالی اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''لو چنے کھاؤ اور بھول جاؤ کہ کبھی تم بھی آدمی تھے اور کباب بنایا کرتے تھے۔''

گنجہ بکرا بنا کھڑا تھا اور تھوتھنی اٹھا کر رحم طلب نگاہوں سے سیاہ پوش آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ آخر یہاں بھی اسی منیجر نے آ کر اسے رہائی دلوائی اور اسے پھر سے انسان بنایا۔ گنجے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر پوری تسلی کی اور تاریخی کہانیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ یہاں ایک عربی چغے والے ڈھیل ڈول آدمی نے تلوار اٹھا کر کہا۔

''مجاہد کیا ہوا تم مٹھی بھر ہو۔ کیا ہوا کہ دشمن کو دیکھ کر تمہاری ٹانگیں کانپنے لگی ہیں۔ کیا ہوا کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ کیا ہوا تمہارے ہاتھوں میں تلواروں کی جگہ مسواکیں ہیں۔ لیکن تم فرزندان وطن ہو۔ وطن کی لاج اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اٹھو کپڑے اتار دو مسواکیں منہ میں لے لو۔ آنکھیں بناوٹی غیض و غضب سے سرخ کر لو اور دشمن پر حملہ کر دو۔ دشمن تمہارے سامنے بیٹھا مزے سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے دس آنے والی کلاس کا صفایا کر دو اور پھر ون ایٹ کی خبر لو اور اس کے بعد گیلری والوں کا صفایا کر دو۔ مجاہدو! خبردار ایک بھی آدمی بچ کر سینما ہال سے باہر نہ نکلے۔''

اس کے بعد مجاہدوں نے جو وہاں تعداد میں صرف چار تھے۔ علی گنجے پر حملہ کر دیا۔ علی گنجہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر اس کمرے سے باہر نکل سکا۔ اس کے بعد پروڈیوسر علی گنجہ رومانٹک فلمی سکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ یہاں تازہ تازہ پالش شدہ پلائی وڈ کی گیلری کے پاس ایک فلمی جوڑا کھڑا باہر چاند دیکھ رہا تھا۔

لڑکا! آہ یہ کپڑے کے آسمان پر گتے کا چاند کتنا پیارا لگ رہا ہے۔

لڑکی: ہاں اور فضا میں پھیلی ہوئی وارنش اور رنگ و روغن کی بدبو کتنی بھلی لگ رہی ہے۔

لڑکا! اوپر آسمان کی طرف دیکھو وہ۔ اوپر مچانوں کے پھٹوں پر بیٹھے ہوئے کالے کالے نیم عریاں لائٹس مین ستاروں کی طرح حسین معلوم ہو رہے ہیں۔

وہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ مجھے میرے پروڈیوسر نے میرے معاہدے کی دوسری قسط ادا کر دی ہے۔

لڑکی: اور میں بھی بہت خوش ہوں کہ آج میری نانی یعنی میری ماں میرے ساتھ نہیں آئی۔ آج میں علی گنجے سے جی بھر کے

پیاری باتیں کرسکوں گی۔

لڑکا: یہ علی گنجا کون ہے۔؟

لڑکی: میرا محبوب۔

اس کے بعد لڑکی نے پلٹ کر علی گنجے کو دیکھا اور

''پیارے گنجے'' کہہ کر اپنی دونوں باہیں اس کے گلے میں حائل کر دیں۔

گنجے نے بڑی مشکل سے اس بدصورت ہیروئن سے نجات حاصل کی اور گھریلو کہانیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک لڑکی سے اس کا اندھا باپ کہہ رہا تھا۔

''تو نے اپنے اندھے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔رانی تو نے میری پگڑی اتار کر میرے سر پر جوتا پہنا دیا ہے۔تو نے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے ہیں۔تو نے میرا پنجرہ خالی کر دیا ہے۔تو نے الٹے استرے سے مونچھیں مونڈ دی ہیں۔

اس کے بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا اور بڈھے کے قدموں پر گر پڑا۔

''ابا جان مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے۔میں آپ کے جوتے پالش کیا کروں گا۔آپ کے ناخن اتارا کروں گا۔رات بھر آپ کے تلووں میں گدگدی کرتا رہوں گا۔آپ کو جی بھر کر دباتا رہوں گا۔میں آپ کا بھرکس نکال دوں گا۔خدا کے لئے میرے ہاتھ میں اپنا پاؤں دیجئے۔''

بڈھے نے لات مار کر غصے سے کہا:

''دور ہو نابنجار۔میں تیری ان چاپلوسیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔میں نے بھی دھوبی گھاٹ کا پانی پیا ہے۔اندھا ہوں تو کیا ہوا۔میرے دل کی آنکھیں تو کھلی ہیں۔دل کی آنکھیں۔''

اور اس کے بعد بڈھے نے اندھی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔

دل کی آنکھیں کھلی ہیں میری پیاری

تو دھیرے سے آ جا ری اکھین میں

نندیا آ جا ری آ جا' دھیرے سے آ جا

گنجے پر بھی رقت طاری ہو گیا۔ اس نے بھی ٹوپی اتار کر زمین پر پھینک دی اور اندھے کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر دل کی آنکھوں والا گیت گانا شروع کر دیا اور یہی گیت گاتے ہوئے وہ دونوں سٹار فلمی سٹور سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد گنجے نے فلم بنانے کے ارادے سے توبہ کر لی۔ آج وہ پہلے کی طرح لنڈے بازار میں کباب لگاتا ہے ایک اندھا سرخ کوئلوں پر پنکھا مارتا رہتا ہے۔ جب کباب بک جاتے ہیں تو دونوں ساتھ مل کر روتے ہیں اور رات گئے تک گاتے رہتے ہیں۔

دل کی آنکھیں کھلی ہیں میری پیاری
تو دھیرے سے آ جا اکھین میں
نندیا آ جا ری آ جا!

◆◆◆

ستم کش چڑیا کوٹی

ستم کش چڑیا کوٹی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور اپنے گھر والوں کو خوب کھا پی رہا تھا۔ اسے بچپن ہی سے شعر کہنے کا مرض تھا۔ ماں باپ نے بہتر علاج کرایا مگر مرض بڑھتا ہی گیا۔ تنگ آ کر ماں باپ نے ستم کش چڑیا کوٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب چڑیا کوٹی کا یہ حال تھا کہ اس نے سر کے بال بڑھا لیے۔ چہرے پر وحشت طاری کر لی۔ منہ میں ہر وقت پان اور انگلیوں میں سگریٹ رہنے لگا۔ بات کسی سے کرتا اور منہ کسی کا تکتا۔ ہر بات کے جواب میں اپنا کوئی نہ کوئی شعر چسپاں کر دیتا۔ چڑیا کوٹی سے پیدل چل کر شہر دہلی میں گیا۔

دلی آ کر اس نے ایک طوائف سے ملاقات کی۔ پہلی ہی ملاقات میں طوائف کے حسن پر ایک فی البدیہ نظم کہہ دی۔ دراصل یہ نظم کسی مشہور شاعر کی تھی جو ستم کش کو ازبر تھی۔ طوائف نے ستم کش کو اتنی اجازت دے دی کہ وہ اس کے گھر پر پڑا رہے۔ ستم کش نے طوائف کے کوٹھے پر اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ وہ اسے غلط ملط غزلیں لکھ کر دیتا۔ تماشبین لوگوں کی آؤ بھگت کرتا۔ ان کے کپڑوں پر عطر لگاتا۔ موقع پاتے ہی کبھی کبھی ان کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی ڈال دیتا۔ تماشبین ستم کش کوٹی کے اس احسن سلوک سے بڑے متاثر ہوتے اور جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اسے بھی دے جاتے۔ ستم کش چڑیا کوٹی کا بڑا اچھا گزارا ہو رہا تھا۔

لیکن ستم کش کے دل کی کلی مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ ترقی کرنا چاہتا تھا وہ آگے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریڈیو پر بھی اس کی غزلیں گائی جائیں۔ اس نے فلم میں بھی گیت لکھے۔ اس کے لئے اسے طوائف کی امداد کی ضرورت تھی۔ اس دوران میں اس نے طوائف حسن آرا کو اپنی خوشامد اور حاشیہ برادری سے بڑا متاثر کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے حسن آرا کو بڑے سبز باغ دکھلائے۔ اس سے کہا کہ وہ کب تک کوٹھے پر بیٹھی ٹھمریاں گاتی رہے گی۔ وہ زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی؟

اگر تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم دونوں مل کر بڑا کام کر سکتے ہیں۔ بس تمہیں فلم کی ہیروئن بنا دوں گا۔ سارے ملک میں تمہارے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔

حسن آرا ستم کش چڑیا کوٹی کی باتوں میں آ گئی۔ ستم کش نے کیا کیا کہ دلی کے ایک نہایت شاندار ہوٹل میں آل انڈیا ریڈیو

کے ڈائریکٹر کی دعوت کی۔ کیونکہ وہ ریڈیو کو اپنی ترقی کا پہلا زینہ بنانا چاہتا تھا۔ ستم کش چڑیا کوٹی نے ہوٹل میں کافی شراب منگوا کر رکھ لی۔

اس رات حسن آرا بھی بڑی بن ٹھن کر آئی تھی۔ محفل سج گئی۔ جام پر جام چلنے لگے۔ حسن آرا نے اس رات صرف مجرا ہی نہیں کیا بلکہ آل انڈیا ریڈیو کے گنجے ڈائریکٹر کی چندیا پر آنکھیں بند کر کے بوسے بھی دیئے اور بعدازاں ستم کش چڑیا کوٹی کو دوسرے کمرے میں بھیج کر ڈائریکٹر کی گنجی چندیا پر سر رکھ کر سو گئی۔ دوسرے روز ستم کش ڈائریکٹر سے ملنے آل انڈیا ریڈیو دلی کے دفتر پہنچ گیا۔ ڈائریکٹر نے ریڈیو پر ستم کش کی غزلوں کے لئے معاہدہ پیش کیا تو ستم کش بولا۔

''حضور معاہدے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ صرف ایک بار میری غزل کسی سے گوا دیں اور بس معاہدہ میں بعض دوستوں کی وجہ سے نہیں کرنا چاہتا۔''

ریڈیو ڈائریکٹر نے سوچا کہ چلو جب ایک شخص صرف ایک غزل پر ہی خوش ہے تو معاہدے کے جھنجٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی روز شام کو ایک عورت نے دلی ریڈیو سے ستم کش چڑیا کی غزل گا دی۔ اگرچہ معاہدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن ریڈیو کی لاگ بک میں ستم کش کی غزل کی انٹری ہو گئی تھی۔

اگلے روز ستم کش چڑیا کوٹی نے ایک وکیل سے مل کر آل انڈیا ریڈیو کو نوٹس دے دیا کہ وجہ بتائی جائے کہ اس نے جو اس کی غزل بغیر کسی معاہدے اور اس کی اجازت کے ریڈیو پر گوا دی ہے تو اس پر کیوں نہ عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ ستم کش نے دس ہزار روپے کا ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔

ریڈیو والے پریشان ہو گئے۔ غزل واقعی بغیر معاہدے کے گوائی گئی تھی۔ اور لاگ بک میں اس کی انٹری بھی موجود تھی۔ مقدمہ شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو والے مقدمہ ہار گئے اور ستم کش نے دس ہزار روپے ہرجانے کے وصول کر لئے۔ دس ہزار روپے اور حسن آرا کو لے کر بمبئی آ گیا۔ یہاں اس نے ایک انتہائی قیمتی ہوٹل میں ڈبل روم کرائے پر لے لیا۔ دونوں نے بہترین کپڑے بنوائے۔ ایک گاڑی چوبیس گھنٹے نیچے کھڑی رہتی۔ ستم کش نے بڑے بڑے فلمی لوگوں کو ہوٹل میں دعوتیں کرنی شروع کر دیں۔

حسن آرا نے فلمی سیٹھوں کو رام کرنا شروع کر دیا۔ ستم کش نے دو مزید خوبصورت لڑکیوں کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر ہی اندر اس نے بیک وقت تین فلمیں بنانے کا اعلان کر دیا۔ ایک کاسٹیوم فلم ایک پنجابی فلم اور ایک سوشل فلم تھی۔

ان میں سے کاسٹیو فلم کامیاب ہوگئی۔ ستم کش چڑیا کوٹی نے اب کاسٹیوم فلمیں ہی بنانے شروع کر دیں۔ اب چونکہ ایک کاسٹیوم فلم کامیاب ہوگئی تھی۔ اسی لئے مارکیٹ میں ہر طرف کاسٹیوم ہی فلمیں بننے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کاسٹیوم فلموں کو بھی ناپسند کرنا شروع کر دیا۔

اتفاق سے ایک سوشل فلم کامیاب ہوگئی۔ اب ہر طرف سوشل فلموں کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ ستم کش نے بھی دو سوشل فلمیں شروع کر دیں۔ فلم دیکھنے والوں کے سر پھر گئے۔ وہ سوشل فلم کو پسند کرتے تو ان کے سر پر دھڑا دھڑ سوشل فلموں کے ہتھوڑے چلنے لگتے۔ وہ کاسٹیوم فلموں کے دامن میں پناہ لیتے تو کاسٹیوم فلموں کے ڈونگرے برسنے شروع ہو جاتے۔ وہ کپڑے پھاڑ کر رسیاں توڑ کر سنیما گھروں سے بھاگ اٹھے۔

ستم کش چڑیا کوٹی نے اپنا بہت بڑا دفتر بنا لیا۔ فلمیں بنانے کا اسے ہلکا کام معلوم ہونے لگا۔ اس نے سمگلنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔ اس کام میں وہ ایک دن میں لاکھوں کما لیتا۔ وہ ریس کھیلتا۔ شراب میں وہ دن بھر دھت رہتا۔ اپنے دوستوں کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شروع شروع میں اس کی مدد کی تھی گالیاں دیتا۔ کئی نئی لڑکیوں کو ہیروئن بنانے کا جھانسہ دے کر ان کی جوانی سے کھیلتا۔ اور پھر اٹھا کر انہیں باہر پھینک دیتا۔

ایک روز اس کی پرانی معاون حسن آرا طوائف اسے ملنے آئی۔ اسے جھریاں پڑ گئی تھیں۔ وہ بدصورت اور بڈھی ہو رہی تھی۔ ستم کش نے اسے منہ نہ لگایا اور دھکے مار کر دفتر سے نکال دیا۔

حسن آرا گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ستم کش چڑیا کوٹی اب لاکھوں کا آدمی ہے۔ لاہور کراچی میں اس کے شاندار دفتر ہیں۔ وہ ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے اس کی شیروانی کا ہر بٹن دس ہزار روپے کی مالیت کا ہے۔ پچھلے دنوں جب وہ لاہور آیا تو اس نے یونہی محفل پر رعب ڈالنے کے لئے اپنی شیروانی کے دو بٹن فروخت کر کے ایک شاندار کار خریدی۔ اس کا اپنا سر پھر چکا ہے۔ اسے آدمی چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ اسے ریس کے گھوڑے اور گھریلو کتے انسانوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ اب اسے کبھی بھی خیال نہیں آیا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا۔ جب وہ دلی کی ایک طوائف کے کوٹھے پر تماشبینوں کو عطر لگایا کرتا تھا۔ اور ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالا کرتا تھا۔

◆◆◆

دکھیا خانم کے دو خط

پہلا خط

میرے پیارے خرگوش کمار!

میرا اسلام محبت قبول کرو۔ اول تو تمہیں میرا خط پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ایک نظر لفافے پر ڈال کر اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دو گے۔ تمہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ اس لفافے کے اندر تمہاری ایک پرستار لڑکی کا معصوم دل دھڑک رہا ہے اور نوکر ٹوکری اٹھا کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دے گا اور اگر میری قسمت نے یاوری کی اور تم نے خط کھول کر پڑھ بھی لیا تو تم اسے محض ایک بے وقوف لڑکی کی بے معنی بکواس سمجھ کر اسے پھاڑ دو گے۔

لیکن میرے پیارے خرگوش کمار جی! میرے دل میں جو تمہارے لئے محبت کا جذبہ موجزن ہے اس کا مقابلہ بحر الکاہل بھی نہیں کرسکتا۔ میں پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ میں گجرات میں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہوں اور نویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ گھر والے یوں مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ اگر ان ظالموں نے مجھے بے بس پرندے کی طرح گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ سوائے سکول جانے کے اور سیدھی گھر آ جانے کے اور کسی جگہ جانے کی اجازت نہیں۔ گھر میں ہر کوئی نماز پڑھتا ہے اور زبردستی مجھے بھی نماز پڑھائی جاتی ہے۔ سینما کا نام لوں تو سب کے چہرے بدل جاتے ہیں۔

پھر بھی خرگوش کمار جی! میں اپنی سہیلی کے ساتھ چھپ چھپا کر تمہاری فلم دیکھ لیتی ہوں۔ کیونکہ تمہاری فلم دیکھنا اور اس فلم میں تمہیں مسکراتے باتیں کرتے، ہنستے، روتے محبت کرتے اور گھوڑا دوڑاتے دیکھنا میری عبادت بن کر رہ گیا ہے۔ میں نے پہلی بار تمہیں سخی لٹیرا میں دیکھا۔ اور تم نے میرا صبر و قرار چھین لیا۔ تمہاری چمکدار آنکھیں گھنگریالے بال موٹی موٹی گردن اور عورت کے سامنے ہو کر شرمانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں اپنا دل تمہارے قدموں میں لٹا بیٹھی۔ دل و جان سے تم پر عاشق ہوگئی۔ تمہارے نام کی مالا جپنے لگی۔ اب میں سارا دن سکول میں بیٹھی تمہارے بارے میں سوچتی رہتی۔ رات کو تمہارے خواب دیکھتی، دوپہر کو تمہارے تصور کو دماغ میں سجا کر سو جاتی۔ میں نے تمہاری ایک تصویر ایک رسالے میں سے کاٹ کر اپنی الماری میں کتابوں کے نیچے چھپا کر رکھ لی۔

صبح اٹھ کر تصویر دیکھنا اور رات کو سونے سے پہلے اس کے درشن کرنا کبھی نہ بھولتی۔ میرا خیال تھا کہ یہ عشق آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ یا کم از کم ایک ہی سطح پر رہے گا۔ لیکن اس نے ترقی کرنی شروع کر دی اور اب یہ حالت ہو گئی وہ ہے کہ نہ دن کو چین ہے اور رات کو قرار ہے۔ پڑھائی میں جی نہیں لگتا۔ ہفتے میں دو تین بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ سکول سے بھاگ کر فلم دیکھتی ہوں۔ ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں۔ کوئی تمہارا نام لیتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کہیں تمہاری تصویر دیکھتی ہوں تو دل تھام کر رہ جاتی ہوں۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔

دو روز بخار میں پڑی رہی اور بے ہوشی میں تمہارا نام لے لے کر تمہیں پکارتی رہی ماں باپ کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے اتنا مارا کہ میرا جسم زخمی ہو گیا۔

لیکن.......

نور خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

محبت تو لافانی ہوتی ہے۔ جب ایک بار کسی سے سچا عشق ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو سوائے اپنے محبوب کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔

میرے پیارے خرگوش کمار میں تو اب تمہارے عشق میں اندھی ہو گئی ہوں۔ مجھے سوائے تمہارے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گجرات کو اپنے گھر بار کو اپنے ظالم ماں باپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آ جاؤں اور ساری زندگی تمہاری لونڈی بن کر گزار دوں۔

پیارے خرگوش جی! میں تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہارا جھوٹا کھا کر گزارہ کر لوں گی۔ تم جو پہناؤ گے ہنسی خوشی پہن لوں گی۔ مگر تمہارے در سے کبھی نہیں ہلوں گی۔ بس میرا اٹل فیصلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور مسرت صرف تمہارے قدموں میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ بس میں آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں' آ رہی ہوں۔

ہمیشہ تمہاری لونڈی۔۔۔۔۔۔۔۔دکھیا خانم

دوسرا خط

میری پیاری سہیلی اکبری!

خدا تمہیں سلامت رکھے اور کبھی لاہور کی فلم انڈسٹری کا منہ نہ دکھائے۔ اگرچہ اس بات کو پانچ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن پھر بھی تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے گاڑی میں سوار کروادیا تھا۔ میں اس دن اپنے ماں باپ کے گھر کو اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر اپنے محبوب خرگوش کمار سے ملنے گھر سے بھاگ کر جارہی تھی۔ تمہیں کتنا دکھ ہورہا تھا۔ اپنے ماں باپ کو چھوڑنے کا صدمہ مجھے بھی تھا۔ مگر اس سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں لاہور جا کر اپنے سپنوں کے شہزادے خرگوش کمار کا دیدار کرسکوں گی اور پھر میں تو اس کے ساتھ ہی باقی زندگی بسر کرنے کا پروگرام بنا کر جارہی تھی۔

میں شام کے وقت لاہور پہنچی۔ اس وقت سردی ہورہی تھی اور لاہور کے بازاروں میں دھواں اور دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سٹیشن سے باہر آ کر ٹیکسی لی اور سیدھا خرگوش کمار کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ خرگوش کمار مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ اس وقت کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میں تو اس کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فلم والے خرگوش کمار میں اور اصل خرگوش کمار میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً اصلی خرگوش کمار کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے دانت زیادہ پان کھانے کی وجہ سے بڑے گندے ہورہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ کچھ گنجہ بھی ہورہا تھا۔ سر میں کچھ بال سفید بھی تھے۔ پھر بھی میرے عشق میں کوئی کمی نہ آئی۔ میں اسے پاگل بلبل کی طرح دیکھتی رہی اور خوش ہوتی رہی۔

خرگوش نے بڑی محبت سے کہا۔

دکھیا خانم تم بڑی خوبصورت لڑکی ہو۔“

میں شرما گئی۔ خرگوش کمار نے میرے گلے میں اپنا بازو ڈال دیا اور میرا منہ چوم لیا۔ مجھے گویا دونوں جہانوں کی دولت مل گئی۔ اس کے بعد خرگوش کمار نے الماری میں سے شراب کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر پینے لگا۔ میں سہم گئی۔ خرگوش کمار نے مسکرا کر کہا۔

”میری جان یہ تو عاشقوں پر حلال ہے۔ لو تم بھی چکھو۔“

میں نے انکار کردیا۔ خرگوش کمار برابر شراب پیتا رہا۔ جب وہ شراب کے نشے میں مگن ہوگیا تو اس کی صورت بگڑ گئی۔ آنکھیں انگارہ ہوگئیں۔ چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ خرگوش کمار نے سب دروازے اندر سے بند کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس نے میری عصمت برباد کردی۔ اب میں شریف زادی نہیں رہی تھی۔ میں ساری رات روتی رہی اور خرگوش کمار میری عصمت

بربادکرتارہا۔

دوسرے روز اس نے پھر وہی حرکت کی میں بے بس تھی۔ گھر واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کوئی دو مہینے اس نے مجھے اپنے پاس رکھا اور مجھے پوری طرح تباہ کر دیا اور پھر ایک روز یہ کہہ کر ایک آدمی کے ساتھ مجھے چلتا کیا کہ:

کوہ مری سے میری بیوی واپس آ رہی ہے۔ تم کچھ روز میرے دوست کے پاس رہو۔ میں تمہیں وہاں آ کر مل جایا کروں گا۔"

خرگوش کمار کا دوست مجھے اپنے ساتھ ایک گندے فلیٹ میں لے گیا۔ اسی بدبخت شخص نے کوئی دو مہینے اس گندے فلیٹ میں رکھا اور فلم میں ہیروئن بنانے کا جھانسہ دے کر مجھے گناہ آلود زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ مجھے اس دوران ایک فلم میں چھوٹا سا رول ملا۔ اس رول کے لئے مجھے ایکسٹرا سپلائر سے لے کر کیمرہ مین اور ڈائریکٹر اور پروڈکشن کنٹرولر تک کے ہاں ایک ایک رات بسر کرنی پڑی۔

اب یہ ہوتا تھا کہ جس فلم میں بھی مجھے چھوٹا سا کام ملتا مجھے ایک ایک رات فلم کے ہر آدمی کے پاس بسر کرنی پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں فلمی بازار میں ایک رنڈی بن کر رہ گئی۔ میں نے کئی فلموں میں چھوٹا موٹا کام کیا اور ہزاروں راتیں مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بسر کرنی پڑیں۔

پیاری سہیلی! اب میں گھر واپس آنے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن اس قابل ضرور ہو گئی ہوں کہ میں ایک کامیاب اداکارہ بن سکوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب مجھ میں وہ ساری صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ جو ایک اعلیٰ اور کامیاب ایکٹرس بننے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً میں صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ پی سکتی ہوں۔ غیر مردوں کے سامنے بیٹھ کر قہقہے لگا سکتی ہوں۔ کوئی میرا بوسہ لے تو مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی کسی دیوار پر ہاتھ رکھ دے۔ میری آنکھوں کی شرم مر گئی ہے۔ جسم کی بے حیائی پوری طرح زندہ ہو گئی ہے۔ ضمیر سو گیا ہے۔ مکاری بیدار ہو گئی ہے۔ سینہ ڈھلک گیا ہے۔ مگر میں نے اسے مصنوعی سہاروں سے پہلے سے بھی زیادہ اونچا کر لیا ہے۔ میں پتھر کی سل بن گئی ہوں۔ فلمی بنئے کی دکان کے باہر رکھا ہوا نمک کا ڈلا بن گئی ہوں۔ جسے کوئی سانڈ بھی آ کر چاٹ سکتا ہے۔

مجھے گجرات کا اپنا چھوٹا سا سکول اور گھر اور ماں باپ بڑے یاد آتے ہیں۔ مگر میں اب انہیں اتنا پیچھے چھوڑ آئی ہوں کہ اگر واپس ان کی تلاش میں نکلوں تو مجھے یقین ہے کہ راستے میں ہی میری زندگی کی شام ہو جائے گی۔ تم نے یقیناً دسویں پاس کر لی ہوگی

اورتمہاری شادی کی فکر ہورہی ہوگی۔ خدا کرے کہ تمہارا بیاہ ہوجائے اورتم اپنے معصوم بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہو۔اور مجھے وہ برقع پوش بھولی بھالی لڑکی بہت یاد آتی ہے جو صبح صبح سکول جایا کرتی تھی اورجس کی انگلیوں پر سیاہی کے دھبے ہوا کرتے تھے۔اب اس لڑکی کے ناخنوں پر نیل پالش رہتا ہے۔وہ ان انگلیوں پر عیاش مردوں کو ننگی کا ناچ نچایا کرتی ہے۔

خدا حافظ

تمہاری سہیلی۔۔۔۔۔۔۔۔دکھیا خانم مرحوم

◆◆◆

جانوروں کا فلمی ایوارڈ

عیدگاہ کے وسیع میدان میں شامیانے لگے ہیں۔ جھنڈیاں رنگ برنگی لہرا رہی ہیں۔
برقی قمقموں نے سارے پنڈال کو بقعہ نور بنا رکھا ہے۔ کرسیاں بچھی ہیں۔ ان کرسیوں پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق گھوڑے، خچریں، بطخیں، بیل، بھینسیں، گائیں، نیولے، چوہے، خرگوش، بکریاں، بکرے، دنبے براجمان ہیں۔ ہر جانور زرق برق لباس میں ملبوس ہے۔ کوئی سگار پی رہا ہے۔ کوئی سگریٹ منہ میں دبائے ہوئے ہے۔ کسی نے وسکی پی رکھی ہے اور کسی نے بیئر چڑھائی ہوئی ہے۔ کوئی چرس پی کر آیا ہے کوئی پینے والوں میں بیٹھ کر آیا ہے اور نشے میں جھوم رہا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو آج ان لوگوں کو جو فلمی دنیا کے مایہ ناز ستارے ہیں فلمی ایوارڈ مل رہا ہے۔ اس ایوارڈ کی تقریب کا انتظام محکمہ پرورش حیوانات کی طرف سے کیا گیا ہے۔ جب سے اس محکمے کو اطلاع ملی ہے کہ کچھ جانور بھی فلمی دنیا میں جا کر فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس محکمے نے ان کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ فلمی ایوارڈ کی تقریب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔
اس اجتماع میں ایکٹرسیں بھی ہیں اور ایکٹر بھی ڈائریکٹر بھی ہیں اور کہانی نویس و مکالمہ نویس بھی۔ سٹیج پر بڑی روشنیاں ہو رہی ہیں۔ اوپر وسط میں ایک بہت بڑے ریچھ کا سر بنا کر لگا رکھا ہے۔ یہ ایوارڈ دینے والوں کا محکماتی نشان ہے۔ یہ سر ایک ایسے مشہور و معروف فلم ایکٹر کا ہے جو ایکٹنگ کرنے، عورتوں کو پھانسنے، شراب پینے اور لوگوں کا پیچھا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ٹھیک نو بجے شب جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ پردہ اٹھا اور سٹیج پر ایک اونٹنی بڑی بنی سنوری آئی۔ اس نے گردن جھکا کر حاضرین کو سلام کیا اور طبلے کی تھاپ اور گھنگروں کی جھنکار پر رقص کرنا شروع کر دیا۔ یہ اونٹنی فلم انڈسٹری کی ایک اعلیٰ پیمانے کی رقاصہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی ایک بھی کل سیدھی نہیں تھی۔ آنکھیں اور ناک ایک ساتھ ٹیڑھی تھیں کمر کا کوہان باہر کو نکلا ہوا تھا سینہ آگے کو نکلتا چلا گیا۔ وہ سٹیج پر ٹانگیں چلاتے ہوئے رقص کر رہی تھی۔ کبھی گردن کو بل دیتی، کبھی ٹانگ اٹھا کر سر پر رکھ لیتی۔ کبھی تھوتھنی آگے کو پھیلا کر ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرتی۔
حاضرین دم بخود بیٹھے تھے۔ اونٹوں کی قطار میں ایک دو اونٹ بے اختیار بلبلا اٹھے اور اپنی گردنیں اٹھا کر لہرانی شروع کر

دیں۔ گدھوں والی کرسیوں کی قطار میں دو تین گدھے ڈھیچوں ڈھیچوں کرنے لگے۔ ایک نیولا اس اونٹنی کا کوہان دیکھ کر غش کھا کر گر پڑا۔

رقص ختم ہوا تو ایک بوڑھا آنکھوں پر عینک لگائے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا دوسرے ہاتھ میں کاپی پکڑے آیا اور بولا۔

معزز مادہ و نر جانور حضرات!

ہمیں خوشی ہے کہ اس تقریب سعید پر جناب ہاتھی کا کوروی نے ہمارا دعوت نامہ قبول کر کے صدر بننے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اب میں جناب ہاتھی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کرسی صدارت پر براجمان ہوں اور انعامات تقسیم کریں۔

ایک جھریوں بھرا ہاتھ اٹھا اور جھولتا جھالتا سٹیج پر آیا اور اپنی سونڈ ہلا کر سب کو سلام کیا اور کرسی صدارت پر بیٹھ گیا۔ بیل نے جو سٹیج سیکرٹری تھے۔ اعلان کے ساتھ بہترین ہیروئن کو انعام دینے کے لئے سر ہلایا۔

''بہترین ہیروئن مس لومڑی جان۔''

ایک لومڑی سٹیج پر کمر مٹکاتی آ گئی۔ سب جانوروں نے تالیاں بجائیں۔ لومڑی جان نے کالا چشمہ لگا رکھا تھا۔ بال انگریزی فیشن پر کٹے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر نیلے رنگ کی لپ سٹک تھی۔ ہاتھ میں سنہری پرس تھا۔ سٹیج سیکرٹری نے جناب ہاتھی کو ایوارڈ کا بت دیا۔ یہ بت ایک چھوٹے سے ریچھ کا مجسمہ تھا۔ صدر نے اٹھ کر ریچھ کا مجسمہ مس لومڑی جان کو پکڑا دیا۔ جانوروں نے تالیاں بجائیں۔ مس لومڑی اپنے تیکھے دانت نکال کر ہنسنے لگی اور ساتھ ہی مکار آنکھیں سکوڑ کر غرانا شروع کر دیا۔ سٹیج سیکرٹری نے ان کی تعریف میں کہا۔

''حاضرین مس لومڑی کو یہ ایوارڈ فلم جنگل کا سوداگر نامی فلم میں کام کرنے پر دیا گیا ہے۔ اس فلم میں مس لومڑی نے ایک عیاش آوارہ عورت کا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ نقل پر اصل کا شبہ ہوتا ہے۔''

اب بہترین ہیرو کا انعام جناب خچر صاحب کو دیا جاتا ہے۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سٹیج پر تشریف لا کر انعام حاصل کریں۔

خچروں کی قطار میں سے ایک خچر صاحب جن کے بال گردن تک بڑھے ہوئے تھے۔ کالا چشمہ لگائے منہ پر لگا ہوا سرخی پاؤڈر پر آیا پسینہ رومال سے پونچھتے اٹھے اور سٹیج پر آ گئے۔ انہوں نے انعام لیا تو حاضرین نے نعرے لگائے۔

''خچر ہیرو زندہ باد۔''

اسٹیج سیکرٹری نے ان کی تعریف میں کہا۔

''جناب خچر صاحب کو یہ انعام ان کی بہترین فلم ''دلا کمار'' پر دیا گیا ہے۔ آپ اگرچہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں ایک نظر میں انہوں نے ایک دیہاتی خچر کا رول بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی آپ میں یہ ہے کہ آپ کی جنس کے بارے میں ابھی تک تحقیق نہیں ہوسکی۔ کوئی انہیں مرد سمجھتا ہے اور بہت سے انہیں عورت سمجھتے ہیں۔ عورتوں کی طرح چلتے ہیں۔ مردوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ عورتوں کی طرح مردوں سے بات کرتے ہیں اور مردوں کی طرح عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔

اپنی تعریف سن کر خچر شرم سے عرق عرق ہوگیا۔ اس نے رومال نکال کر بار بار اپنی لمبی تھوتھنی پونچھنا شروع کردی۔ پھر وہ بھی سٹیج پر سے تشریف لے گئے۔ اب بہترین ویلن کو سٹیج پر بلایا گیا۔ سیکرٹری نے اعلان کیا۔

اب اس سال کے بہترین ویلن جناب بھینسا تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو ان کی بہترین فلم لڑاکا شہسوار پر انعام دیا جارہا ہے۔

بھینسوں کی قطار میں سے ایک موٹا تازہ بھینسا گھوں گھوں کرتا۔ ناک چڑھاتا تھوتھنی گھماتا' دم اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر کرسیوں پر مارتا اٹھا اور سٹیج پر دو تین بار اچھل کر کھڑا ہوگیا اور سر جھکا کر' کھر جوڑ کر کھڑے ہوکر یوں پینترا بنایا جیسے ابھی صدر کے ٹکر مار دے گا۔ صدر نے ڈر کر فوراً ریچھ کا بت ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے قہر آلود آنکھوں سے صدر کو دیکھا اور پھر مسکرا دیئے۔ سیکرٹری نے ان کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

''جناب بھینسا صاحب کو فلم کا فن اپنے آبا و اجداد سے ملا ہے۔ برائی کا پارٹ کرنے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ جب آپ پردہ سیمیں پر سینگ تان کر آنکھیں سیکڑ کر منہ سے کف جاری کر کے غصے سے دیکھتے ہیں تو بڑی بڑی ہیروئنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ 80 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتے ہیں۔ ایک ہی ٹکر سے بڑے بڑے سنیما گھر کی دیوار ڈھا سکتے ہیں۔ پلک جھپکنے میں ہیرو ہیروئن کے درمیان پہنچ جاتے ہیں۔ ایک سو کیلے' سو درجن مالٹے بارہ تربوز اور ڈیڑھ سو پپیتے ان کے ناشتے پر ہوتے ہیں۔ فن کی خدمت کرتے کرتے ان کی عقل موٹی اور ٹانگیں پتلی ہوگئی ہیں۔''

حاضرین نے تالیاں بجائیں۔ ایک خرگوش خوشی سے پھدک کر بکری کے سر پر بیٹھ گیا۔ ایک بندر اچھل کر ایک گدھے کی کمر پر بیٹھ گیا اور تالیاں بجانے لگا۔

اب سیکرٹری نے سٹوری رائٹر کو سٹیج پر بلایا۔

''میں جناب گینڈا دریا آبادی کو انعام وصول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔''

اب ایک گنجے سر والا گنجہ سا گینڈا فراخ نتھنوں سے فوں فوں کی آواز پیدا کرتا پچاس پالوں کا بنڈل کلے میں دبائے انہیں پاگلوں کی طرح چباتا جگہ جگہ تھوک کے پرنالے چھوڑتا سٹیج پر آیا اور انعام وصول کر کے دو کھر اوپر اٹھا کر لہرا کر بولا۔

''شکریہ دوستو! میں اس قابل نہیں ہوں۔لیکن آپ نے بڑی عزت افزائی کی۔''

سٹیج سیکرٹری نے آپ کی تعریف میں کہا۔

''جناب گینڈا دریا آبادی کو یہ انعام ان کی بہترین کہانی عبور ''دریائے شور'' کی وجہ سے دیا جارہا ہے۔آپ نے یہ کہانی بڑی محنت سے لکھی ہے۔لکھنے میں گینڈا صاحب کا جواب نہیں۔آپ چڑیا گھر کے تالاب میں لیٹ کر کہانی لکھتے ہیں۔پان کی پوری ایک ٹوکری منہ میں ڈال کر ایک گھنٹہ اس کی جگالی کرتے ہیں۔پانچ سیر تمباکو حقے میں ڈال کر پیتے ہیں۔افیون کا پورا گولہ کلے میں ڈال کر گھٹ ہو جاتے ہیں۔اس سے پہلے آپ جنگل میں لکڑہارے تھے اور درخت کاٹ کر بیچا بھی کرتے تھے اور کھایا بھی کرتے تھے۔لیکن فلم کی دنیا میں آکر ان کی کایا پلٹ گئی۔اب یہ پروڈیوسروں اور فلم دیکھنے والوں کی گردنیں توڑتے ہیں۔''

اس پر گینڈے نے بڑے جوش میں آکر سیکرٹری کو پکڑ کر اس کی گردن توڑنا چاہی۔لیکن سٹیج سیکرٹری اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر صاحب صدر کی ٹانگوں میں جا چھپا۔

حاضرین میں سے ایک بکری میں میں کرتی اٹھی اور سٹیج پر آکر گینڈا صاحب سے لپٹ گئی۔گینڈا صاحب نے فوراً بکری کو کمر پر بٹھالیا اور سٹیج پر سے اتر آئے۔

اتنے میں سارے پنڈال کی بتیاں گل ہوگئیں۔حاضرین نے شور مچانا شروع کر دیا۔نیولے بھاگ گئے۔خرگوش پھدکنے لگے۔مچھر کمے دکھانے لگے۔بکریاں ممیانے لگیں۔گھوڑے ہنہنانے لگے۔بجلی واپس آئی تو سٹیج سیکرٹری گھبرائے نظر آنے لگے کیونکہ جس میز پر انعامی مجسمے رکھے ہوئے تھے وہ خالی پڑی تھی۔سیکرٹری نے روتے ہوئے کہا:

''پیارے بھائیو! ہمیں افسوس ہے کہ اب ہم باقی انعام نہیں دے سکیں گے۔کیونکہ کوئی کمینہ میز پر سے باقی سارے انعامی مجسمے اٹھا کر لے گیا ہے۔''

اس پر سارے پنڈال میں شور مچ اٹھا۔ابھی گدھوں' گھوڑوں' بکریوں اور کئی میمنوں کو انعام ملنا باقی تھا۔انہوں نے چیخ چیخ کر کلے تان تان کر کہا۔

''یہ تمہاری آؤ بھگت ہے۔کمینے! تم نے خود مجسمے گم کر دیئے ہیں۔ہم تم سے انتقام لیں گے۔ہم تمہارا حقہ پانی بند کر دیں گے۔

اب حاضرین میں سے ان گنت گھوڑے' خچریں' خرگوش اور بکرے سینگ تان کر سٹیج پر دوڑے۔ انہوں نے ہلہ بول دیا۔ سیکرٹری اور صدر کو اٹھا کر عیدگاہ کے پنڈال سے باہر گندے نالہ میں پھینک دیا۔

◆◆◆

ایک دن کی بادشاہت

یوں تو انارکلی میں ہر روز ہی رونق ہوتی ہے۔ مگر جو مینا بازار اتوار کو لگتا ہے۔ اس کی نظیر ہفتے کے باقی دنوں میں نہیں ملتی۔ اس مینا بازار کی ساری گہما گہمی ان خانہ بدوش دکانداروں کی مرہون منت ہے جو اتوار کے سنہری موقع پر انارکلی کی دکانوں کو بند پا کر اپنا بوریا بستر بچھا کر فروخت کی چیزیں سجا دیتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ ہفتے میں چھ دن ناغہ کرتے ہیں اس اعتبار سے انہیں صرف ایک چھوٹی سی تختی لٹکانی پڑتی ہے۔ جس پر لکھا ہوتا ہے:

''آج ناغہ نہیں ہوگا!''

نظام سقے نے ہمایوں سے ایک دن کی بادشاہت حاصل کر کے چمڑے کا اپنا سکہ چلا دیا تھا۔ یہ لوگ اپنا سکہ تو نہیں چلا سکے لیکن انہوں نے انارکلی کے دکانداروں سے ایک دن کی بادشاہت ضرور حاصل کر رکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ بادشاہ لوگ جلاوطنوں ایسی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ آیئے آپ کی ملاقات روزگار کے اس جزیرے میں جلاوطن پہلے بادشاہ سے کرائی جائے۔ یہ بزرگ جو سو رہے ہیں۔ لکھنو کے قریب ہردوئی کے رہنے والے ہیں۔ سو پشت سے پیشہ آباء عطر فروشی ہے۔ خود بھی ایک عطر کی پھیری ہیں۔ مگر زمانے کی گردش خوشبو اڑا لے گئی ہے۔ اب نہ رنگ ہے نہ باس۔ جوتوں کی سیڑھیوں پر عطر پھلیل کی دکان سجا کر خود آرام فرما رہے ہیں۔ بہت تھک گئے ہیں۔ پاؤں نے ہردوئی سے لاہور تک کا فاصلہ پیدل طے کیا ہے۔ کندھوں نے گیارہ سال تک نصف درجن بچوں کا بوجھ اٹھایا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر تیل آملہ کی بوتل اٹھائی تو اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا چاہتے میاں؟''

''بھوپال کی اگربتیاں ہیں بڑے میاں؟''

''بھوپال کیوں میاں؟ کراچی' کا مال کیوں نہیں لیتے! یہ لو مست شباب اگربتی۔ ذرا سلگاؤ۔ اگر ہوش نہ اڑ جائیں تو دام واپس۔ کراچی تو بھوپال سے بازی لے گیا بھائی۔''

''آپ ہر اتوار کو یہاں ہوتے ہیں کیا؟''

''اجی یہ تو اپنی پیٹنٹ دکان ہے۔''

ٹرنکوں کی ایک مشہور دکان کے تھڑے پر ایک صاحب الیکٹرک سلوشن بیچ رہے تھے۔ دری پر سامنے چینی کے ٹوٹے ہوئے جڑے ہوئے برتن بکھرے پڑے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے پنے تلے مشینی انداز میں سلائی اٹھائی اور یوں بولتے چلے گئے۔ جس طرح خراد کے چلنے سے لوہے کا برادہ گرنے لگتا ہے۔

''سلائی لے کر اس پر روئی چپکائیں الیکٹرک سلوشن کی شیشی میں ڈالیں۔ ٹوٹے ہوئے برتن کو بائیں ہاتھ میں لے کر اس کے کناروں پر سلوشن لگائیں پھر دوسرا ٹکڑا چپکا کر آہستہ سے ہاتھ پھیر دیں۔ ہاں گرم نہ کریں۔

پھر زمین پر پھینک دیں۔ برتن دوسری جگہ سے ٹوٹے گا۔ کیا مجال جو جڑی ہوئی لکیر آنکھ بھی کھول جائے۔ سر میں درد ہو تو ماتھے پر لگا کر انگوٹھے سے دبائیں۔ ہاں گرم نہ کریں۔ دانت میں درد ہو تو ہتھیلی پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے مسوڑوں پر ملیں۔ گرم مسالے کی طرح مرچیں ضرور لگیں گی۔ مگر درد غائب ہوگا۔ یہ جنگل نہیں جناب انارکلی ہے۔ ابھی آزمائش کرلیں۔ ہاں گرم نہ کریں۔''

ایک بڑی شاندار میناری کی بند دکان کے باہر ایک صاحب نے اپنی مٹیاری سجا رکھی تھی۔ انہوں نے بڑی کاریگری سے بند دکان کا ایک دیدہ زیب شوکیس اپنی عارضی دکان کی آرائش کے لئے استعمال کرلیا تھا۔ میں نے پوچھا آپ اس شوکیس کا کرایہ دیتے ہیں؟'' کیونکہ دوسرا شوکیس پردے میں ڈھکا ہوا تھا۔

''کرایہ کون چھوڑتا ہے بھائی نہ مالک مکان نہ زمین نہ آسمان۔ کوئی کسی کو نہیں چھوڑتا۔ وہ زمانہ لگا ہے کہ اپنے تو چھکے چھوٹ گئے ہیں۔''

''لیکن اس شوکیس نے آپ کی دکان سجادی ہے۔''

''یہ دکان میری وجہ سے سج رہی ہے اور دکان کی وجہ سے شوکیس سج رہا ہے۔

ذرا دوسرے شوکیس کو بھی دیکھیں۔ کیا ویرانی برس رہی ہے۔''

''آپ باقی دن کیا کرتے ہیں؟''

''گھوم پھر کر سرخی پوڈر بیچتے ہیں۔''

''میں نے گھوم کر دیکھا۔ مچھر دانیاں بیچنے والے نے باٹا کی دکان پر قبضہ جما رکھا تھا اور چھولداری نما مچھر دانیاں دکان کے روشن دانوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ وہ ان کے درمیان بیٹھا جاسوسی کہانیاں پڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے وہ رات کو مچھر دانی کے بغیر سوتا

ہو گا۔

''اجی مچھر تو امیروں کو کاٹتے ہیں۔''

شمیز، انگیا اور پراندے بیچنے والا ہفتے کے باقی دنوں میں لنڈے بازار میں گھوم پھر کر مردوں کے لئے دھوتیاں بیچتا ہے۔ اس کی دکان پر نیم دیہاتی عورتوں کا ہجوم تھا۔ لاہور کی فیشن ایبل عورتیں اتوار کو انارکلی میں نظر نہیں آتیں مرد گاہکوں کی تعداد بھی زیادہ تر چھاؤنی کے فوجیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

''یہ لوگ بڑے اچھے گاہک ہوتے ہیں۔ ذرا لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کا کام ہی لڑنا ہے۔''

یہ بات مجھے ایک کشمیری خواجہ امرتسری نے بتائی۔ خواجہ صاحب کپڑے کی ایک بند دکان کے چبوترے پر دریاں، تھیلے گیند بلے اور بچوں کے کھلونے بیچتے ہیں۔

''امرتسر میں اپنا پشمینے کا دھندا تھا۔ ہزاروں کا مال ہاتھ سے نکلتا تھا۔ یہ موج میلہ بھی اتوار کو لگتا ہے۔ باقی دن گھر میں بیٹھ کر رفوگری کرتا ہوں۔''

''آپ اس کام سے خوش ہیں؟''

''خدا کا شکر ہے جی۔ روٹی مل جاتی ہے۔ بابو جی! آدمی کے پاس یا تو زر ہو یا اولاد لائق ہو۔ لیکن جی۔ زر بھی مصیبت ہے۔ اولاد لائق ہوگی۔ تو اپنے کام آئے گی۔ ہمیں کیا دے گی۔ بس جی ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے کہئے کوئی تھیلا دکھاؤں؟''

لیکن میں وہاں سے جا چکا تھا اور اب ایک لمبی چوڑی دکان کے بند دروازے پر جا بجا لٹکے کیلنڈروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں ہر قسم کی تصویریں موجود تھیں۔ علامہ اقبال کی تصویر والے کیلنڈر کے ساتھ مسرت نذیر کا کیلنڈر تھا۔ ''شان اسلام'' کے عنوان پر اتاترک مصطفیٰ کمال کی تصویر تھی۔ ساتھ ہی ''سبزیوں کا چارٹ'' لگا تھا۔ ایک کیلنڈر میں جاپانی لڑکیاں جانگئے پہنے حوض کے کنارے کھڑی تھیں۔ دوسرے میں ولایتی نیم برہنہ عورتیں ساحل پر لیٹی غسل آفتاب کر رہی تھیں۔ لوگوں کی ایک ٹولی بت بنی کھڑی تھی اور انہیں آنکھیں پھاڑے تک رہی تھی۔ یہاں حقیقتاً نظارے کو جنبش مژگاں بھی بار تھی۔ میرے کانوں میں الیکٹرک سلوشن والے کا جملہ گونج رہا تھا۔

''بائیں ہاتھ میں پیالہ لے کر اس پر سلوشن لگائیں۔ مگر ہاں گرم نہ کریں!

◆◆◆

الحمرا کی ایک شام

''پروٹو پلازم زندگی ہے۔حرکت ہے،مادہ حیات ہے۔حیوانوں کے علاوہ نباتات میں بھی اس کے اثرات ملتے ہیں۔سنسکرت والوں نے اس کا ترجمہ پران کیا ہے۔ جو اس کے مفہوم کو من عن ادا کرتا ہے۔ باقی رہا ہمارے وجود کے اندر ایٹم کے پروٹون الیکٹرون اور نیوٹرون کے عمل کا مسئلہ تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ۔''

الحمرا کے لان میں چیڑ کے اونچے اونچے درختوں کے نیچے بے حد حبس ہو رہا تھا۔سورج غروب ہو چکا تھا۔مگر ہوا بند تھی اور گھاس بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ میرا سائنس دان دوست میرے پاس کرسی پر بیٹھا مجھے برابر لیکچر پلا رہا تھا۔میری خطا صرف اتنی تھی کہ میں گھاس کا تنکا توڑ کر اسے ہاتھ میں لے کر پوچھ بیٹھا تھا۔

''کیا اس میں بھی لائف ہوتی ہے؟''

ہم یہاں ایک محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔مہمان لوگ لان میں یہاں وہاں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔لمبی لمبی سفید پوش میزوں پر خوبانیوں کی پلیٹیں سج رہی تھیں۔گرمی کے مارے سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ایک پنجابی عورت نے پارسی گاؤن پہن رکھا تھا اور چینی طرز کے پنکھے سے چہرے کو بڑی نزاکت سے ہوا دے رہی تھی۔سرد مشروبات اور خوبانیوں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی گئی۔کئی اور لوگوں نے پہلے کوکا کولا پیا بعد میں خوبانیاں کھائیں۔بعض نے پہلے خوبانیوں پر ہاتھ صاف کیا اور بعد میں کوکا کولا سے دو دو ہاتھ کئے۔ بہر حال فتور معدہ میں ہر دو فراق مبتلا ہوئے اور کرسیوں پر کروٹیں بدلتے رہے۔میرے سائنسدان دوست نے خوبانیوں کے بعد سوڈا پیا اور سوڈے کے بعد پھر خوبانیاں نوش جان کیں۔ بلکہ کنسرٹ کے دوران بھی وہ جیب سے خوبانیوں کی گھٹلیاں نکال نکال کر کٹکتا رہا۔

کنسرٹ کا وقت شام ساڑھے چھ کا دیا گیا تھا۔لیکن پورے سوا سات بجے ''کھیل'' شروع ہوا۔بظاہر ہال میں پنکھے لگے ہوئے تھے مگر ان کی ہوا فرش پر آنے کی بجائے واپس چھت کو جا رہی تھی اور گرمی یہاں بھی مہمانوں کا بھرکس نکال رہی تھی بلکہ کچھ لوگ تو ہال سے بھی نکل گئے تھے۔سب سے پہلے ایک صاحب سٹیج پر ایک پرچہ لے کر نمودار ہوئے اور انہوں نے مائیک پر چٹکی مار کر اسے

نشست کیا اور اپنی انگریزی تقریر میں کلچرل ایسوسی ایشن کے اجرا کی غرض وغائت پر روشنی ڈالی اور خود غائب ہو گئے۔
اب پردہ اٹھ گیا اور سامنے سفید ساڑھی میں ملبوس دھان پتی سی بنگالی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے پروگرام کی تفصیل بیان کی اور پھر پروگرام شروع ہو گیا۔ جب سے پہلے جو صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے طلعت محمود کی گائی ہوئی غزل کا چربہ بلکہ چربی اتاری۔ آپ نے سر جھکا رکھا تھا اور بڑے انہماک سے گا رہے تھے۔
''جلی شاخِ نشیمن تو باغبان بھی جلا۔''
اگلی قطاروں میں ایک بیگم صاحبہ کے فرزند ارجمند نے خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ بچہ روتا رہا اور ''طلعت محمود'' بڑے انہماک سے گاتا رہا۔ میرے دوست نے مجھے کندھا مار کر کہا۔
''بچہ پیدا ہوتے ہوئے بھی روتا ہے۔ بھلا کیوں؟''
''خدا معلوم''
''تمہیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر عبور ہونا چاہیے۔ لو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی رونا کیوں شروع کر دیتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ قدرت کو اس کے اندر اور باہر کے ہر عضو کی شدت سے حرکت مطلوب ہوتی ہے۔ دنیا میں آتے ہی ادھر ادھر کے جراثیم اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وائٹ کارپسلز بیدار ہو جاتے ہیں۔ جنگ شروع ہو جاتی ہے اور نزاع سے بے چین ہو کر بچہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس بیگم صاحبہ کے بچے کے ریڈ کارپسلز۔''
اب سٹیج پر ایک صاحب دوزانو ہو کر بیٹھے تھے اور آنکھیں بند کر کے جگ موہن کا ایک غیر فلمی گیت گا رہے تھے۔

مجھے نہ سپنوں سے بہلاؤ

گیت کی پیاری پیاری ہلکی پھلکی زبان اور موضوع کی سندرتا نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ میرا دوست اس میں سے بھی کوئی پروٹو پلازم کی گنجائش نہ نکال لے کیونکہ گیت کار اب اس بندر پر پہنچ گیا تھا۔

گنگا سو تم آؤ نہا کر
کیس سکھاؤ بانہہ پھیلا کر

اور میری نگاہوں میں بنگال کے کسی دریا کے کنارے والے گاؤں کا نقشہ گھوم گیا۔ جہاں ایک مکان کے کھلے آنگن میں کیلے کے درختوں کی گہری سبز چھاؤں میں لمبے لمبے بالوں اور مدھ بھری سیاہ آنکھوں والی ایک لڑکی کلیوں کے سفید گجرے پہنے گیلے اور

کھلے بالوں کو جھٹک کر سکھا رہی ہے اور دور ناریلوں کے جھنڈوں کے اوپر برسات کی پہلی گھٹا دبے پاؤں اوپر اٹھ رہی ہے۔ آم کے ذخیروں میں دل جلی کوئلوں نے کوکنا شروع کر دیا ہے۔

''کٹک''

میرے دوست نے جیب سے خوبانی کی گٹھلی نکال کر اسے دانتوں تلے رکھ کر دبایا اور مزے سے اس کی گری کھانی شروع کر دی۔

میری اگلی قطار میں ایک تنگ ماتھے اور آم ایسی ٹھوڑی والی عورت بڑے قیمتی کپڑے پہنے بیٹھی ریشمی رومال سے چہرے کو ہوا کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک فراخ نتھنوں اور گنجے سر والا آدمی بیٹھا تھا۔ جو ہر دو منٹ کے بعد اس کی طرف جھک کر کوئی بات کرتا۔ جس کے بعد وہ عورت رومال منہ کے آگے رکھ کر کبھی کبھی ہنسنا شروع کر دیتی۔

اب سٹیج پر ایک دبلے سے آدمی وائلن بجا رہے تھے۔ وائلن کا گز ان کے ہاتھ میں بڑھئی کی آری کی طرح چل رہا تھا۔ وہ بڑی محنت سے راگ نکال رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کنوئیں سے کسی آدمی کو نکال رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں میرے فزکس کے رسیا دوست سے نہ رہا گیا۔

''یوں لگتا ہے کہ میوزک کا گلا کاٹ رہا ہے اور سنو۔ جب دو آوازیں ہم آہنگ ہوتی ہیں تو وائبریشن کا پہلا اصول ہے کہ۔''

''کھی کھی کھی''

ریشمی رومال والی عورت ہنسنے لگی۔ کیونکہ اس دوران اس کا گنجہ ساتھی اس کی طرف جھک کر کچھ کہہ چکا تھا۔ اب جو پردہ گرا تو پردے کے عقب سے گھنگروؤں کی مترنم آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی۔ ایک دو بار مائیکروفون یوں کڑکڑایا جیسے کوئی کڑک مرغی چرانے کی کوشش کر رہا ہو۔

پردہ اٹھا اور دو بچیوں نے ہارمونیم اور طبلے کے ساتھ کلاسیکل رقص کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ رقص اس پروگرام کا بہترین آئٹم تھا۔ دونوں بچیوں نے بڑی فنکارانہ نفاست اور خوبصورتی سے رقص پیش کیا۔ ان کے پاؤں قالین پر بڑے آہنگ اور لے کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا گویا وہ سٹیج پر نہیں بلکہ کسی گلستان کی ہری ہری نو دمیدہ گھاس پر معصوم فرشتوں کی طرح محو رقص ہیں۔

لوگ دم بخود تھے۔ ریشمی رومال والی عورت پنکھا جھلنا بھول گئی تھی۔ اس کے گنجے ساتھی کے نتھنے حیرت سے اور زیادہ فراخ ہو

گئے تھے۔لوگ گرمی کا احساس تک کھو بیٹھے تھے۔باہر مال روڈ پر سے گزرنے والی موٹروں بسوں کی بے ہنگم لے اور مشینی آوازیں بہت دور ہو گئی تھیں۔کبھی وہ رقص کرتے یوں آگے بڑھتیں جیسے اچانک جھاڑیوں میں زخمی کبوتری دیکھ لی ہو اور کبھی یوں پیچھے ہٹتیں جیسے خوفزدہ ہو گئی ہوں۔میرا سائنسدان دوست خوبانی کی گٹھلی ہاتھ میں لے کر منہ کھولے بیٹھا تھا اور اپنا آپ بھول گیا تھا۔شاید وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ میوزک رقص بہار زندگی اور معصومیت کے ہیوی چارج سے سر تال کی جھنکار میں گھنگرووں کے الیکٹرون اور پروٹون کتنی تیزی سے فضا میں اڑ رہے تھے۔

رقص ختم ہو گیا۔سرخ پھولوں سے لدی وادی اندھیاروں میں ڈوب گئی سایہ دار درختوں میں چھپی ہوئی جھاڑیوں سے اوجھل ہو گئیں۔مال پر بسوں اور موٹروں کا شور پھر بلند ہو گیا۔گرمی پھر تنگ کرنے لگی۔خوبانیوں کی گٹھلیاں پھر کٹکٹائی جانے لگیں۔گنجا آدمی پھر سے جھک کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا اور وہ عورت پھر ریشمی رومال منہ پر رکھ کر ہنسنے لگی۔

بچیوں کے رقص کے بعد ایک صاحب نے جو غزل شروع کی تو اچانک ہال کی روشنیاں بجھ گئیں۔ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔لوگ اپنی اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے لگے۔کچھ بے قرار ہو کر اٹھے اور ہال سے باہر نکل گئے۔اس پر ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک زندہ دل صاحب جنہیں اندھیرے میں گانے کا بہت شوق تھا۔اچک کر سٹیج آ گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بکرے کی ایسی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

اندھے کی لاٹھی تو ہی ہے۔

تو ہی جیون! جیارا

اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے موسیقی کو اندھے کی لٹھ کی طرح گھمانا شروع کر دیا۔ہال میں بیٹھے ہوؤں کو سیدھی چھری سے ذبح کیا جا رہا تھا۔مگر سورگ باشی سہگل کی روح کی گردن پر الٹی چھری چلائی جا رہی تھی۔ہال میں روشنی ہوئی تو وہ میوزک کا سورما پس کہیں غائب ہو گیا۔

اس پروگرام کی سب سے بہترین اور پر اثر غزل ایک نوعمر لڑکے نے سنائی۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے لاچار جی سے ہم

ایک تو اس گھٹیا قسم کے فلمی گیتوں کے ماحول میں ایک معیاری اور خالصتاً اردو شعری روایات کی حامل غزل تھی۔دوسرے

گانے والے نے اسے بڑے بچے تلے شدھ اور روایتی انداز میں گایا۔ چنانچہ اس غزل پر لوگ ہال میں کھسر پھسر میں مشغول رہے۔ انہیں تو سستی قسم کی فلم دھنوں پر سر دھننے کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے تو ایک طرف سے واہ وا کا شور اٹھا۔ میرے سائنس دان دوست نے کہا۔

''غالباً یہ کوئی مشہور گویا ہے؟''

جب اس نے غزل گانی شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ رنڈیوں ایسے پیشہ ورانہ انداز کا ماہر ہے۔ مگر آواز نہ کسی مجمع گیر ایسی کرخت ہے یہ آواز ایک ایسے خشک درخت سے ملتی جلتی تھی جو اوپر والی شاخوں میں جا کر جل گیا ہو۔ بالکل منحنی اور چنّی آواز تھی۔ جیسے بوریاں سینے والے سوئے میں سے موٹی سُتلی گزر رہی ہو۔

تیسری قطار میں بیٹھا ہوا گنجا آدمی اب رومال سے گردن کندھے چھاتی اور نتھنے پونچھ رہا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے گنجے سر پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا اور آم ایسی ٹھڈی والی عورت کے گھنگھریالے بالوں کو دیکھ کو گانے والے کو داد دی۔

''سبحان اللہ!''

''کھی کھی کھی''

ایک مہمان آرٹسٹ نے بینجو پر ایک فلمی دھن سنائی۔ یہ ایک چوڑی چکلی داڑھی والے مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے بینجو کھول کر منہ میں ایک پیپنی رکھی۔ بینجو کے تاروں کو چھیڑا اور فلمی دھن شروع کر دی۔ اس دھن کی گت بڑی زندگی خیز بلکہ ہنگامہ خیز تھی۔ چنانچہ لوگ اس سے بہت محفوظ ہوئے۔ مولوی صاحب بڑے جوش میں آ کر بینجو بجا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ منہ سے پیپنی بھی بجائے جا رہے تھے جو انہوں منہ میں ایسے تھام رکھی تھی جیسے مینڈک نے ہرا ہرا ٹڈا پکڑ رکھا ہو۔ پیپنی برابر چیخ رہی تھی مگر مولوی صاحب اسے چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

مولوی صاحب کے بعد دو انتہائی خوش رنگ والی ساڑھی پوش لڑکیاں آئیں اور انہوں نے مل کر ایک غزل گائی۔ وہ بڑی احتیاط سے گا رہی تھیں اور سر تال کے دائرے میں ہی گھوم رہی تھیں۔ میرے دوست نے کہا۔

''ان کی ساڑھیاں ان کی آواز سے زیادہ خوبصورت۔''

''لو خوبانی کی گری کھاؤ۔''

اب جو میں نے خوبانی کی گری چباتے ہوئے غور سے سنا تو واقعی ان کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔ یا شاید میرے ہی کان بج

رہے تھے۔ بسنتی ساڑھی والی کا رنگ زرد تھا۔ ریشمی رومال والی نے تنگ ماتھے پر آیا ہوا مختصر سا پسینہ بڑے طویل انداز سے پونچھا اور گنجے سر کی طرف دیکھا گنجہ سر جھک گیا۔

''پانی'' گنجہ سر بجلی ایسی تیزی سے اپنی جگہ پر سے اٹھا اور کرسیوں کو پھلانگتا لوگوں کے گھٹنوں سے گھٹنے بھڑاتا پاؤں پر پاؤں رکھتا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس تھا۔ وہ خود ہانپ رہا تھا اور پسینے میں بھری ہوئی اس کی نائلون کی قمیص جسم سے چپک گئی تھی۔ وہ اسی طرح کرسیاں پھلانگتا ایک مشاق مداری کی طرح گلاس کو ہتھیلی پر ترازو کے تول لے کر ریشمی رومال کے پاس جا پہنچا۔ ٹھنڈا پانی پیش کیا اور پالا مار کر آئے ہوئے مرغ کی طرح چھاتی پھلا کر رومال سے گردن پونچھنے لگا۔ دونوں سہیلیاں برابر گا رہی تھیں۔ میں نے سائنسدان سے پوچھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ آواز سوائے وائی بریشن کے اور کچھ نہیں لیکن کیا تمہارے بدن میں کوئی ریڈ کار پسل ایسا بھی ہے جہاں اس میٹھی لوچدار آواز کا اثر ہوتا ہو؟''

''ہوتا ہے ضرور ہوتا ہے۔ مگر تمہاری طرح ہم زمین پر لیٹ نہیں جاتے۔ منہ لٹکا کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ اس آواز کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہمیں پوری طرح معلوم ہوتا ہے کہ لتا کی آواز اس وقت کتنی ولوسٹی سے کس فری کوانیسٹی پر کتنی والیوم کے ساتھ کہاں کہاں اثر کر رہی ہے۔ اگر آواز کو وو فری کوامیسیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ملک۔''

میرے دوست نے اپنی ہی بات کاٹ کر جیب سے خوبانی کی گٹھلی نکالی اور منہ میں ڈال کر اسے کٹک سے توڑ دیا۔

''تم اسے جذباتیت کہو گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھ پر میلان کے ''کارا کالا'' تھیٹر کا ہمہ گیر میوزک بھی اتنا ہی اثر کرتا ہے جتنا کہ ایک اداس دوپہر کو گیروے کپڑے والے پاکستانی سپیرے کی بین کی آواز اثر کرتی ہے۔ کٹک تمہارے اندر جو ریڈ کار پسلز ہیں ان پرستی اور کاہلی کا اثر بہت زیادہ ہے۔ کٹک تم صبح اٹھ کر سر کے بل کٹک کھڑے ہو جایا کرو اور گلوکوز کا ایک بڑا چمچہ بالمی پانی میں گھول کٹک گھول کر اسے ڈیک لگا کر کٹک کٹک پی جایا کرو۔ پھر۔''

''حضرات اب ہمارے آرٹسٹ قومی ترانہ گائیں گے۔''

سٹیج پر اس اعلان کے ساتھ ہی ہال میں بیٹھے بھی لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ قومی ترانہ شروع ہوا۔ لوگ خاموشی اور احترام کے ساتھ کھڑے تھے۔ قومی ترانے کے ساتھ ہی یہ محفل موسیقی ختم ہو گئی۔ گنجے سر والے نے دستر خوان ایسا رومال منہ پر رکھ کر بڑے زور سے ناک صاف کی اور ریشمی رومال والی صاحبہ کے آگے آگے لٹو کی طرح گھومتا راستہ صاف کرتا انہیں لے کر باہر نکل

گیا۔

میرے سائنسدان دوست نے پورا منہ کھول کر ایک لمبی جمائی لی اور ریچھ کی طرح بازو ہلاتا میرے ساتھ چل پڑا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے جیب سے خوبانی کی آخری دو گٹھلیاں نکالیں۔ ایک میرے ہاتھ میں تھمائی اور دوسری خود اپنے منہ میں ڈال لی۔

"کٹک"

◆◆◆

خیالی پلاؤ

''تمہاری پیشانی کتنی خوبصورت ہے۔''

''طلائی جھومر کی محتاج ہے۔''

''تمہاری کلائیاں کس قدر نازک ہیں!''

''سونے کے کنگن پہن کر حسین ہو جائیں گی۔''

''لیکن نیلم! چاند زیور کا محتاج نہیں ہوتا۔''

''سامنے والے مکان میں جب کسی لڑکی کو بنارسی ساڑھی میں دیکھتی ہوں تو دل تھام کر رہ جاتی ہوں۔ ساتھ والے مکان سے جب طلائی چوڑیوں کی جھنکاریں سنتی ہوں تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہوں۔''

''گھبراؤ نہیں پیاری! ہم آج ہی یہ مکان تبدیل کر لیں گے۔''

''کٹ''

ڈائریکٹر کی آواز گونجی اور فل لائٹس گل کر دی گئیں۔ صرف ایک فلڈ لائٹ کی روشنی میں اداکار پنکھے کے گرد آن جمع ہوئے۔ گرمی کے مارے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ اوپر کے مکالمے ایک طوائف اور اس کے چالاک زمانہ ساز عاشق کے درمیان ادا ہوئے تھے۔ طوائف کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ بار بار میک اپ درست کر رہی تھی۔ کیمرہ مین اگلے سین کے لئے روشنی کا مناسب انتظام کروا رہا تھا۔ ڈائریکٹر سکرپٹ ہاتھ میں لئے ایکٹریس کے پاس بیٹھا اسے دوسرے منظر کے مکالمے یاد کروا رہا تھا۔ ایکٹریس ٹھنڈا آلو بخارا منہ میں ڈالے کھائے جا رہی تھی اور ہر مکالمے پر سر ہلاتی جا رہی تھی۔ ایکٹریس کی نانی یا والدہ یا بڑی بہن اپنے یا ایکٹریس کے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور بچہ ماں کا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

''لائٹس اون۔''

فل لائٹس۔ سائی لینس۔!''

ڈائریکٹر زور سے چلایا اور طوائف فیلڈ میں آ کر قالین پر اس طرح اوندھے منہ لیٹ گئی۔ جیسے کسی نے اسے چاقو مار کر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا ہو۔ منظر بھی ایسا ہی تھا۔ طوائف کو اس کا یار چاقو سے گھائل کر گیا ہے اور وہ قالین پر گری نزع کے عالم میں اپنی ماں کو یاد کر رہی ہے اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے۔ سین کی ٹیکنیک شروع ہو گئی۔ طوائف نے زخمی حالت میں ہاتھ پاؤں آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

''پروردگار! میرے گناہ بخش دینا۔ میں نے ساری عمر لوگوں کو دھوکہ دیا۔ پیار کا لالچ دے کر ان کے خرمن عقل و ہوش پر ڈاکہ ڈالا۔ مجھے معاف کر دینا۔ ماں میری ماں!''

''کی اے پتر داماں؟''

ایکٹریس کی ماں نے بیٹی کو اپنا نام لیتے سنا تو چپ نہ رہ سکی۔

''کٹ''

ڈائریکٹر نے جھنجلا کر کہا۔

''سارے سین کا بیڑا غرق کر دیا بائی تو نے۔''

''وے پتر مینوں کی پتہ؟''

ڈائریکٹر سر کجلاتا ہوا کرسی پر جا گرا۔ بچہ گود میں مسکرایا اور ماں کا انگوٹھا چوسنے لگا۔ اسے انگوٹھا چوستا چھوڑ کر ہم سٹوڈیو کے فلور نمبر 2 میں آ گئے۔ یہاں ایک پنجابی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہیرو زخمی حالت میں چارپائی پر پڑا تھا اور ہیروئن پاس ہی بیٹھی اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ گلیسرین کے موٹے موٹے آنسو اصلی آنسوؤں کے برعکس اس کی پلکوں پر لٹکے ہوئے تھے اور گرنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ ایک آنسو ایک آنکھ میں تھا اور دوسرا آنسو دوسری آنکھ میں۔ صرف دو عدد آنسو تھے اور ہیروئن نے رو رو کر اپنا برا حال کر رکھا تھا۔ ہیرو صرف کبھی کبھی منہ بگاڑ کر آہستہ سے کراہتا تھا۔ ہیروئن کو پنجاب کی ایک الھڑ مٹیار کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس کے بال ماتھے پر آڈرے ہیپرن کی طرح کٹے ہوئے تھے اور کمر پر نقلی پونی ٹیل بھی لہرا رہی تھی۔ سین ختم ہوا تو ہیرو نے پٹی پھینک کر نعرہ مارا اور بڑے پنکھے کے سامنے کھڑے ہو کر پسینہ سکھانا شروع کر دیا۔ ہیروئن آئینہ لے کر آنکھوں میں سرمہ اور اس کے بعد گلیسرین ڈالنے لگی۔ ڈائریکٹر کرسی پر بیٹھ گیا اور برف کا ڈلا اپنے سر پر ملنے لگا۔

اب ہم فلور نمبر 3 میں تھے۔

یہاں فاضل ہدایت کار نے اپنی چیخ پکار اور فلک شگاف نعروں سے اسٹوڈیو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کسی کو اندر آتے دیکھ کر شیر کی طرح دھاڑ مارتے' کسی کو باہر جاتے دیکھ کر بلی کی طرح غراتے' ایکٹریس کو اپنے قریب دیکھ کر زور سے ڈکار مارتے' پیٹ پر ہاتھ پھیرتے' گردن کھجلاتے۔ سگریٹ سلگاتے۔ ایکٹریس جھوٹ موٹ شرم سے دہری ہو جاتی۔ ڈائریکٹر اس کی کمر پر زور سے ہاتھ مار کر دھاڑتے۔

''تیار ہو جاؤ بھئی۔ چپ ہو جاؤ بھئی۔
شروع کرو بھئی۔ ٹیک نمبر 3 سٹارٹ۔''

کیمرہ مین نے آواز دی:

''ڈائریکٹر صاحب ذرا پرے ہٹ جائیے۔ آپ کیمرے کے آگے کھڑے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا بھئی۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔''

انہیں اپنا کام کرتے چھوڑ کر ہم لوگ سٹوڈیو کے لان میں آ گئے۔ یہاں ایک زیر تکمیل فلم کا آؤٹ ڈور سیٹ لگا تھا۔ جنگل کے وسط میں کیلے کے درختوں کے درمیان ماہی گیروں کی جھونپڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک لڑکی بنگالی مچھیروں کا لباس پہنے رقص کر رہی تھی۔ ارد گرد لوگ جمع تھے۔ عورتیں بچوں کو اٹھائے کھڑی تھیں۔ بوڑھے گھاس پر بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ جھونپڑیوں کے اندر لالٹینیں جل رہی تھیں۔ باہر مشعلیں روشن تھیں۔ لڑکی ناچ بھی رہی تھی اور گیت بھی گا رہی تھی۔

شاید فلم نہیں گیت فلمانا سب سے زیادہ بور اور تھکا دینے والا کام ہے۔ رقاصہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔ اس کے پاؤں شاہ نور سٹوڈیو کے لان کی مٹی میں لت پت تھے۔ یہ بنگال کا جنگل نہیں تھا بلکہ شاہ نور سٹوڈیو کا لان تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جو کیلے کے درخت گاڑے گئے تھے۔ ان کے اکثر پتے خشک ہو کر مرجھا رہے تھے۔ لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ جس پر سے بنگال کی مچھیرن یا ہیرا منڈی کی ''داراں'' کو ناچتے ہوئے گاتے ہوئے ایک ٹانگ اٹھائے لان میں بیٹھے ہوئے گاؤں والوں کے درمیان آ کر اپنے رقص کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہاں بہت رونق تھی۔ ایکسٹرا لوگ سرخی پوڈر تھوپے اینٹھ اینٹھ کر چل پھر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو دل ہی دل میں یقین تھا کہ فلم کی کامیابی کے بعد ہیرو نہیں تو سائڈ ہیرو کا کردار انہیں مل کر ہی رہے گا۔ ایکسٹرا لڑکیاں سفید اور گیروے رنگ کی بنگالی وضع کی ساڑھیاں پہنے گھاس پر ٹولیوں کی شکل میں بیٹھیں گپ بازی کر رہی تھیں۔ کہیں کچھ لڑکیاں قیمہ چھولے منگوا کر کھا رہی تھیں۔ کھانے کی بریک میں ابھی دیر تھی اور انہیں ٹیک ری ٹیک کی ورزش کے باعث بھوک لگ رہی تھی۔

''داراں'' کوڈانس ماسٹر ایک طرف لے جا کر ڈانس کی ریہرسل کروا رہے تھے۔ وہ بڑی پھرتی اور شوخی سے پاؤں اٹھا اٹھا کر چل رہی تھی۔ اور ہر ایک سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ کبھی کیمرہ مین کو آنکھ مارتی۔ کبھی اپنی ایکسٹرا سہیلیوں کو گلے لگاتی اور میک اپ مین کا ہنس ہنس کر جی برماتی۔ آخر کیوں نہ ہو اسے بھی تو ایک دن ہیروئن بننا ہے۔

ریہرسل ختم ہوئی۔ ڈائریکٹر نے چیخ مار کر آرٹسٹوں کو بلایا کیمرہ مین نے چیخ مار کر فل لائٹس اون کروائیں۔ نائب ہدایت کار نے چیخ مار کر لوگوں کو خاموش کروایا۔ پلے بیک گانے کی آواز بلند ہوئی۔ کلیپ دیا گیا۔ کیمرہ سٹارٹ ہوا۔ بنگال کی مچھیرن یعنی ''داراں'' بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں کو کنول کے پھول کی طرح بنائے ایک ٹانگ پر تھرکتی ہوئی بانس کے پل پر سے اترنے لگی۔ ادھر ادھر لوگوں کے درمیان بڑی بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی ایکسٹرا لڑکیوں نے ہدایت کار کے اشارے کے مطابق اپنے اپنے بازوؤں پر سے ساڑھیوں کے پلو سر کا لئے۔ ہر آدمی کو یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ ڈانس کے دوران صرف رقص کرتی ہوئی رقاصہ کو ہی دیکھے۔ لیکن ایک سفید ریش ایکسٹرا بزرگ اپنے قریب بیٹھی ہوئی موٹی تازی ایکسٹرا لڑکی کے ننگے بازو کو دیکھے جا رہے تھے۔ ڈائریکٹر کی اچانک نظر پڑ گئی۔

''کٹ''

ایک چیخ بلند ہوئی اور ڈائریکٹر' کیمرہ مین' میک اپ مین' ڈانس ماسٹر اور پلے بیک گانے بجانے والا سر پیٹ کر رہ گیا۔

رقاصہ کا ناچ ناچ کر بھرکس نکل گیا تھا۔ وہ کٹ کا نام سنتے ہی زمین پر بیٹھ گئی اور پھر لیٹ گئی۔ سفید ریش بزرگ کی خوب خبر لی گئی۔ دوسری بار جب شوٹنگ شروع ہوئی۔ تو سفید ریش ایکسٹرا کی آنکھیں رقاصہ کی طرف تھیں لیکن نگاہیں پاس بیٹھی ہوئی موٹی تازی ایکسٹرا کے ننگے بازو پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈائریکٹر بھی تنکھیوں سے سفید ریش بزرگ کی حرکت کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک بار پھر کٹ کہنے کا مطلب تو تین سو کا نقصان تھا۔ چنانچہ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اور ''داراں'' کی رقص کرتی ہوئے ننگی پنڈلیوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ داراں کی والدہ صاحبہ لان کے ایک گوشے میں ننگے بیچ پر چت لیٹی تھیں اور چائے کا کپ پی کر اب ٹانگ پر ٹانگ رکھے تمبا کو والا پان کھا رہی تھیں۔ قریب ہی زمین پر چائے کا خالی کپ پڑا تھا۔ ٹیکنگ ختم ہو چکی تھی اور اب دوسرے شاٹ کی تیاریاں شروع ہو رہی تھیں۔ ''داراں'' اپنی والدہ کے قریب آ کر میک اپ میں سے پاؤڈر لے کر منہ پر تھوپ رہی تھیں۔ ''داراں'' کی ماں نے اس کی ساڑھی کا پلو کھینچتے ہوئے کہا:

''نی پیٹ ننگا کیوں نہیں رکھتی!''

◆◆◆

خواجہ عمر عیار فلم اسٹور

خواجہ عمر عیار فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے پارسی تھیٹروں میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے فن میں بڑے ماہر تھے۔ تھیٹر کے ڈراموں میں انہیں عام طور پر دو قسم کے پارٹ ملا کرتے تھے یا وہ جٹا دھاری جوگی کے روپ میں سامنے آتے جو ہیروئن کی موت کے بعد دنیا کی بے ثباتی کے بارے عبرت انگیز گانا گاتا اس کی لاش کے قریب سے گزر جاتا اور یا وہ جلاد بنتا اور بادشاہ کے اشارے پر چشم زدن میں مجرم کی گردن اڑا دیتا۔ تھیٹر کا دور ختم ہوا تو خواجہ صاحب کا بیکاری کا دور شروع ہو گیا۔ انہوں نے تھیٹر کی چھوٹی بہن فلم کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے کئی حربے آزمائے اداکاری کی فلمی کہانیاں لکھیں، میک اپ مین کی ٹرائی دی۔ چوکیداری کی فلم اسٹاروں کی حجامت کی، میوزک ڈائریکٹر بننے کی کوشش کی۔ مگر انہیں کسی محاذ پر بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ حالت روز بروز پتلی ہوتی چلی گئی اور جب اتنی پتلی ہو گئی کہ دیکھی نہ گئی۔ تو خواجہ صاحب ایک رات چراغ جلا کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنی ایک پرانی کنڈم تھیٹریکل کہانی کا حلیہ بدل کر اسے فلمی کہانی میں تبدیل کر دیا۔ پہلے یہ کہانی ایک پتی ورتا استری کی قربانیوں کی نصیحت آموز داستان تھی اور اب وہ ایک جاسوسی اور لڑائی مارکٹائی سے بھرپور کہانی بن گئی تھی۔ اس کہانی میں انہوں نے ایک درجن امریکی فلموں کی ڈرامائی مناظر تھوڑے بہت ردوبدل کے بعد شامل کئے تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب نے پروڈیوسر کو بڑے ڈرامائی انداز میں سنائی۔ ڈرامائی سین پر وہ کرسی سے اچھل کر تن کھڑے ہو جاتے اور سینہ پھلا کر پروڈیوسر کو گھورنا شروع کر دیتے۔ دردناک منظر آتا تو روتے روتے ان کی گھگھی بندھ جاتی۔ لڑائی کے سین پر وہ پروڈیوسر سے لپٹ جاتے اور کمرے کی دیواروں سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر لہولہان کر لیتے۔ پروڈیوسر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً چیک کاٹ کر خواجہ عمر عیار کے حوالے کیا اور دوسرے ہی ہفتے کہانی کی فلم بندی کا آغاز کروا دیا۔ خواجہ صاحب کی یہ فلم بڑی کامیاب ہوئی۔ بس پھر کیا تھا۔ دھڑا دھڑ فلمی معاہدے ہونے لگے۔ خواجہ صاحب نے اس ایک کہانی سے بڑا کام لیا۔ اسی کہانی کو وہ ذرا سی تبدیلی کے بعد معاشرتی تواریخی، اسلامی، سوشل اور پنجابی بنا دیتے۔ معاشرتی کہانی میں وہی ہیرو جو جاسوسی کہانی میں کالا ہیٹ پہنتا تھا۔ قراقلی کی ٹوپی اور شلوار پہن لیتا۔ پنجابی کہانی میں وہ بانسری منہ کے ساتھ لگا کر بھینس کے پاس بیٹھ جاتا اور اسلامی کہانی میں وہی شخص گھوڑے پر سوار تلوار ہاتھ میں لئے نعرہ تکبیر کرتا

دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتا۔

خواجہ صاحب کی روز افزوں ترقی اور کامیابی نے انہیں عدیم الفرصت بنا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس اتنا وقت نہ بچتا کہ وہ فلم کی کہانی ہی لکھ سکیں۔ اب انہوں نے کچھ منشی نوکر رکھ لئے جنہیں خواجہ صاحب نئی فلمی کہانیوں کے ہیرو، ہیروئن اور ویلن کے نام اور پلاٹ کا آئیڈیا بتا دیتے اور وہ لوگ فوراً نصف درجن فلمی کہانیاں تیار کر کے رکھ دیتے۔ یہاں سے خواجہ صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس کاروبار میں وسعت پیدا کی جائے اور ایک بہت بڑا فلم سٹور کھولا جائے۔ جہاں سے میوزک سے لے کر فلمی کہانیوں تک ہر مال مناسب نرخوں میں مہیا کیا جائے۔

چنانچہ خواجہ صاحب نے خواجہ عمر عیار فلم سٹور کے نام سے اس اپنی طرز کے انوکھے ادارے کی بنیاد رکھ دی۔ یہ سٹور شہر کی ایک جدید ترین اور خوبصورت ترین سڑک پر واقع ہے۔ سٹور کی عمارت میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ کو خواجہ صاحب کا دفتر ہے۔ دیواروں پر مختلف فلم ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ انہوں نے طرح طرح کے کاسٹیوم زیب تن کر رکھے ہیں۔ کارنس پر خواجہ کی دو تصویریں رکھی ہیں۔ ایک تصویر میں وہ جوگی بنے آنکھیں بند کئے مالا پھیر رہے ہیں اور دوسری تصویر میں وہ جلاد بنے ایک مجرم کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کرسی پر براجمان ہیں اور بے حد مصروف نظر آ رہے ہیں۔ میز پر تین عدد ٹیلیفون پڑے ہیں۔ ضرورت مند اندر داخل ہو کر پانچ روپیہ فیس ادا کرتا ہے۔ اگر اسے جاسوسی کہانی مطلوب ہے تو خواجہ صاحب انہیں جاسوسی ڈیپارٹمنٹ کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔

جاسوسی ڈیپارٹمنٹ

اس کمرے کے باہر ایک نقاب پوش آدمی پہرہ دے رہا ہے۔ آپ کے لئے دروازہ کھول کر وہ مشکوک نظروں سے آپ کو دیکھے گا اور دروازہ بند کر کے ایک دلدوز قہقہہ لگا کر خود ہی چوکنا ہو جائے گا اور ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دے گا۔ کمرے کے فرش پر ریت کی ہلکی سی تہہ بچھا دی گئی ہے۔ جس پر آپ کے جوتوں کے نشان ثبت ہو جائیں گے۔ ایک آدمی سگار منہ میں دبائے سیاہ فیلٹ پیشانی پر جھکائے بیٹھا ہے۔ بائیں ہاتھ میں اس نے جیب کے اندر پستول تھام رکھا ہے اور دائیں ہاتھ میں پنسل لئے وہ نوٹ بک پر کچھ لکھتا جا رہا ہے۔ آپ کے سلام کا جواب وہ بڑے پراسرار طریقے سے سر ہلا کر دے گا۔ اس کے بعد وہ فائل نکال کر فلمی کہانی سنانا شروع کر دے گا۔

”رات کا ہولناک سناٹا۔ اللہ ہو کا عالم۔ ناگہاں بجلی چمکتی ہے۔ قدموں کی آواز کٹ پستول کا کلوزاپ کٹ ایک عورت کا گھبرایا

ہوا چہرہ پستول کی آواز۔ (اور وہ آدمی جیب سے پستول نکال کر چھت پر فائر کرتا ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتے ہیں) عورت کی چیخ (اس کے ساتھ ہی کمرے میں دوسری میز پر بیٹھی ہوئی عورت چیخ مارتی ہے۔ آپ کانپ اٹھتے ہیں) پولیس کی موٹر کی آواز O/L ہوتی ہے۔ پکڑو پکڑو، خون خون کٹ میں دکھاتے ہیں۔ عورت کی لاش خون میں لت پت بستر پر پڑی ہے۔ لاش تڑپ رہی ہے۔ ڈی زالو کرتے ہیں۔ وہی کمرہ 'دوسری رات' جاسوس اندر داخل ہو کر پائپ جلاتا ہے۔ پاؤں کے نشان پر جھک کر کان لگاتا ہے۔ اس کا ساتھی قالین پر سے بجھا ہوا سگریٹ اٹھا کر سلگانے لگتا ہے۔ جاسوس چیخ مارتا ہے۔'' اسے وہیں رکھ دو۔ اس کا ساتھی ڈر کر سگریٹ وہیں پھینک دیتا ہے۔ ایک کالی بلی صوفے کے پیچھے سے دیکھتی ہے اور اچانک جاسوس کی آنکھوں پر جھپٹتی ہے۔ جاسوس کی چیخ نکل جاتی ہے۔ (اس کے ساتھ ہی وہ آدمی زور سے خوف ناک چیخ مارتا ہے۔) جس کے نتیجے میں کہانی سننے والا گاہک بے ہوش ہو جاتا ہے۔ چوکیدار اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں پھینک آتا ہے۔ اس کمرے کے باہر سوشل کہانیاں نام کی تختی لگی ہے۔

سوشل کہانی ڈیپارٹمنٹ

اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے۔ پاندان اگلدان پڑے ہیں۔ کنارے والے صوفے پر ایک اچکن پوش نوجوان اپنے ادھیڑ عمر کے باپ سے ہمکلام ہے۔

بیٹا: نجمہ میری زندگی ہے ابا حضور! میں اس کے بغیر گھاس کاٹ سکتا ہوں مگر زندگی کے دن نہیں کاٹ سکتا۔

باپ: اسلم! تم نے باپ کو گالی دی ہے۔ سماج کے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔

بیٹا: محبت سماج کی دشمن ہے ابا حضور!

باپ: مجھے ابا کہہ کر میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔

بیٹا: آپ نمک کا نام لے کر میری نمک خواری کی توہین مت کیجئے۔ میں نجمہ سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میری ہے۔ یہ شادی ضرور ہو گی۔

باپ: نکل جاؤ میرے گھر سے او نا ہنجار۔ کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا تھا؟ آہ!

(آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر) میری آنکھیں میری آنکھیں کیا میں اندھا ہو گیا؟

بیٹا: ابا حضور۔

باپ: (رقت بھری آواز میں گاتا ہے)

میں اندھا ہوں

یا دوزخ میں ہوں

اور خدا کا بندہ ہوں

باپ گرتا پڑتا، گاتا، روتا لڑکھڑاتا باہر نکل جاتا ہے اور بیٹا قالین پر غش کھا کر کونے والے صوفے پر جا گرتا ہے۔

فلمی کہانی کا طلب گار پروڈیوسر چکرا کر دوسرے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

رومانی کہانی ڈیپارٹمنٹ

یہاں ایک فلمی جوڑا نقلی تالاب کے کنارے بیٹھا خرمستیاں کر رہا ہے۔لڑکی کاغذ کا پھول سونگھ کر کہتی ہے۔

لڑکی: ہائے کتنی سہانی خوشبو ہے۔

لڑکا: مشک آنست کہ خود بگوید۔

نہ کہ عطار بگوید

لڑکی: پیارے تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔

لڑکا: تمہیں دیکھ کر کون کافر ہوش میں رہ سکتا ہے۔!

لڑکی: آہ! مجھے اپنی اماں یاد آنے لگی ہے۔

لڑکا: انہیں بھی یہاں کیوں نہ لے آئیں؟

لڑکی: محبت ماں باپ سے بے نیاز ہوتی ہے۔

لڑکا: آہ وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی۔

لڑکی: بکواس بند کرو۔

لڑکا: تم دروازہ بند کرو۔

لڑکی: محبت کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔

لڑکا: کیا گھر والے سب سو رہے ہیں؟

لڑکی: گہری نیند میں۔

لڑکا: ڈویٹ گانے کا نادر موقع ہے۔

لڑکی: تو بسم اللہ کیجئے!

میں بن کا نچر بن میں خرخر بولوں رے

لڑکی: میں کاٹھ کی ہنڈیا گھر گھر میں کھڑ کھڑ بولوں رے

جب یہ دونوں فلمی عاشق معشوق جی بھر کر' گلا پھاڑ کر گا چکتے ہیں تو ایک دوسرے کے گلے کی رگوں پر تیل مالش کرتے ہوئے ہم کلام ہوتے ہیں۔

لڑکا: میں تو تیری محبت کے جنگل کا تارزن ہوں پیاری اور اپنے جذبات کا گوریلا ساتھ لئے تمہاری تلاش میں چیختا چلاتا پھر رہا ہوں۔

لڑکی: (ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) شی! آہستہ بولو۔ گھر والے جاگ پڑیں گے۔ پروڈیوسر وہاں سے تارزن کی طرح لمبی مارتا ہے اور ساتھ والے کمرے میں جا گھستا ہے۔

تاریخی کہانی ڈیپارٹمنٹ

اس کمرے میں دربار لگا ہے۔ ایک بادشاہ بابل والوں کا لباس پہنے فرعون بنا مصر کے تخت پر بیٹھا ہے۔ دربار کے ستون مغل طرز کے ہیں۔ درباریوں میں کسی کا لباس واسکوڈے گاما سے ملتا ہے۔ تو کسی کی پگڑی نانا فرنویس کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ایک سپاہی یونانی لباس میں ملبوس مہابھارت کے عہد کا تیر کمان لگائے کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ درمیان میں ایک دیوانہ پھٹا ہوا سلیپنگ سوٹ پہنے کھڑا مٹر مٹر تک رہا ہے۔

بادشاہ: (پاؤں زور سے مار کر) کیوں بے رومن قوم کے ذلیل کتے تیری یہ مجال کہ ہماری ملکہ سے عشق کا دم بھرے۔

دیوانہ: میں اس کی چلمیں تک بھرنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ کیا میری شیریں حقہ پتی ہے؟

بادشاہ: سپاہیو! اس دیوانے کی گردن اڑا دو۔

سپاہی گردن اڑاتے ہیں دیوانے عاشق کی گردن تھوڑی دیر اڑتے رہنے کے بعد پھر دھڑ سے آن جڑتی ہے درباری

تالیاں بجاتے ہیں۔

بادشاہ: (غصے میں دھاڑ کر) خاموش! میں تم سب کی گردنیں اڑا دوں گا۔ میں مصر کا بادشاہ ہوں۔

دیوانہ: کیہ گل اے بادشاہو۔

بادشاہ (چیخ کر) سپاہیو!

سپاہی: (سب ہم زبان ہو کر) جی سرکار!

بادشاہ: اس بدلگام کو چاروں طرف سے گھیر اڈال کر پا بہ زنجیر کر کے یہاں سے لے جاؤ اور صبح سورج نکلنے سے پہلے کوہ آتش فشاں میں جھونک دو۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

شیریں: جھروکے سے چھلانگ لگا کر دربار میں کھڑی ہو کر) مگر یہ بانسری ہمیشہ بجتی رہے گی۔ (تھوڑی دیر راگ مالکونس میں بانسری بجاتی ہے۔ پھر دیوانے عاشق کے گلے میں بانہیں ڈال کر) چل میرے پیارے اہم ایمن آباد چلے جاتے ہیں۔ ہم وہاں جا کر ایک ہارس پاور کا انجن لگا کر دھان کوٹا کریں گے۔

دیوانہ عاشق: چل پیاری ایمن آباد کو چل۔

دونوں باہر نکلتے ہیں بادشاہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

بادشاہ: (وزیر سے) افراسیاب۔

افراسیاب: جی حضور!

بادشاہ: ہاف سیٹ چائے۔ پتی تیز ہو جلدی!

اتنا سن کر باقی درباری بھی چائے پینے قریب کے ہوٹل کی طرف چل پڑتے ہیں۔

پروڈیوسر صاحب بھی چائے منگواتے ہیں۔ چائے پی کر دوسرے کمرے کا رخ کرتے ہیں۔

اسلامی جوشیلی کہانی ڈیپارٹمنٹ

پروڈیوسر اندر داخل ہوتے ہی سہم کر ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں ایک اسلامی مجاہد ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے

ہاتھ پر مرغ بٹھلائے' گھوڑے پر سوار مجاہدین کے جم غفیر سے مخاطب ہے۔ مجاہدین کا نقاہت کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔ میک اپ پسینہ بن کر بہہ رہا ہے۔ گھوڑے کی ٹانگیں مارے کمزوری کے کانپ رہی ہیں اور معلوم ہو رہا ہے کہ ابھی گرا کہ گرا۔ مگر فلمی مجاہد برابر دھاڑے جا رہا ہے۔

مجاہد: فلم کے اسلامی دلیرو! اپنی لکڑی کی تلواروں سے اس سینما ہال میں بیٹھے ہوئے دس آنے ایک روپیہ چھ آنے اور دو روپے دس آنے والوں پر دھاوا بول دو۔ یاد رکھو کوئی بھی دشمن بچ کر نہ جائے۔ ڈائریکٹر تمہیں ہر تماش بین کے سر کے عوض تین فلموں کا کنٹریکٹ دے گا۔ دشمن بہادر ہے قوی ہے وگرنہ یہ فلم دیکھنے ہمارے قلعے کی دیواروں تلے کبھی جمع نہ ہوتا۔ ہم نے اس کی جیب تو کاٹ لی ہے۔ اب اس کی گردن بھی کاٹیں گے۔ اس کے دانت کھٹے کر دیں گے۔ اس کے سر پر پتھروں کی بارش کریں گے۔ یاد رکھو! اس جنگ میں جو سپاہی زندہ رہا وہ ہیرو کہلائے گا اور جو مر گیا وہ بھی ہیرو ہی کہلائے گا۔ اب ڈائریکٹر' پروڈیوسر اور رائٹر کا نام لے کر حملہ کر دو۔ نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر!''

اس سے پیشتر کہ فلم کا یہ اسلامی لشکر حملہ آور تا فلمی کہانی کے خواہش مند پروڈیوسر نے پاؤں سر پر رکھے اور وہاں سے بھاگ کر سڑک پر آ گیا۔ خواجہ عمر عیار نے اسے زندہ نکل کر جاتے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے تالی بجائی اور ایک مہیب صورت زنگی کو اس کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ جو تھوڑی ہی دیر بعد پروڈیوسر کو چوہے کی طرح ہتھیلی میں دبوچے اندر لے آیا۔ خواجہ عمر عیار نے اپنی جوگی والی تصویر الٹ دی۔ جلاد والی تصویر سامنے رکھ کر میز کے نچلے دراز میں سے ایک نئی فلمی کہانی کا مسودہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد گاہک کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے بال کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور سر اپنے آپ دائیں بائیں ہلنے لگا۔ خواجہ صاحب کہانی سناتے چلے گئے جب کہانی ختم ہوئی تو گاہک کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کیونکہ اس کہانی میں اسلامی سوشل تاریخی' جاسوسی اور رومانی سارے ہی لوازمات شامل تھے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

◆◆◆

کوڈے شاہ

جناب کوڈے شاہ پاکستان کے مایہ ناز فلم ڈائریکٹر ہیں۔ آپ ذہانت اور فطانت ساتھ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور ساتھ ہی لے کر مریں گے۔ آپ نے اب تک بیس فلمیں بنائی ہیں۔ باقی چار سو فلمیں چھ سالہ پلان کے تحت زیر تکمیل ہیں۔ جس طرح بعض لوگ پیدائشی اندھے ہوتے ہیں اسی طرح آپ پیدائشی ڈائریکٹر ہیں۔ چنانچہ آپ کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ پیدائش کے وقت آپ نے اس دنیا میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ تا آنکہ آپ کی دایہ نے ایک تختی دکھائی جس پر لکھا تھا۔

تولید ڈائریکٹر کوڈے شاہ

پیدائش۔۔۔۔۔۔4

سین۔۔۔۔۔۔1

ٹیک۔۔۔۔۔۔3

بعد ازاں آپ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور جب دایہ ناف کاٹنے لگی تو آپ نے ایک ہاتھ اٹھا کر اور چیخ کر فرمایا۔

''کٹ!''

آپ کی بیشتر فلموں نے ملک کے کونے کونے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور گڑھے ہوئے مردوں کو اکھاڑا ہے۔ کیونکہ اکثر آپ کا موضوع شیریں فرہاد، وامق عذرا، گاما ماجھا اور دنگا فساد رہا ہے۔ شروع شروع میں آپ اپنی فلم کا ایک موضوع متعین کیا کرتے تھے۔ لیکن جوں جوں آپ نے ترقی کی آپ ان فروعات سے بلند ہوتے گئے ہیں۔ اب ان کی فلم اپنا موضوع خود مرتب کرتی ہے۔ بلکہ اب تو موضوع تماش بین متعین کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک فلم ''کمانی دار چاقو'' کے بارے میں لوگ مختلف خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فلم ٹریجڈی ہے۔ کیونکہ ہیروئن آخر میں اپنی ماں کا مغز کھا کر مرجاتی ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ فلم کامیڈی ہے کیونکہ مسخرہ ہیروئن کی والدہ صاحبہ سے شادی کر لیتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا خیال ہے کہ فلم کا اصل موضوع اصلاح معاشرہ ہے۔ کیونکہ ہیروئن بار بار اپنے بھرے بھرے کولہے مٹکا کر اپنے باپ کے سامنے

مجرا ڈانس پیش کرتی ہے اور ہیرو نے کئی بار اظہار عشق کرتے ہوئے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا ہے۔ لیکن جناب کوڈے شاہ کا خیال ہے کہ ابھی فلم نے اپنا موضوع تلاش نہیں کیا۔

جناب کوڈے شاہ کو پاسنگ شو کے سگریٹ اور پکوڑے بڑے مرغوب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت آپ گھر سے باہر تشریف لاتے ہیں تو آپ کی صورت دیکھ کر پکوڑے والا پکوڑوں کا تھال اور پنواڑی پاسنگ شو کے ڈبے فوراً چھپا دیتا ہے۔ شراب آپ مچھلی کیطرح پیتے ہیں اور ہمیشہ تیسری بوتل پر آؤٹ ہوتے ہیں اور آؤٹ ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ خالی بوتلوں کو گھر بجھوا دیتے ہیں۔ تاکہ صبح دودھ والے آنے میں بیچی جا سکیں۔ شراب آپ مجبوراً پیتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ڈائرکشن نہیں ہو سکتی۔ آؤٹ بھی مجبوراً ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر شراب کا مزا نہیں آتا۔ آپ ہمیشہ چند ایک ایکسٹرا لڑکیوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کو چھوٹے طبقے کے مسائل سے بڑی دلچسپی ہے۔ آپ پرانے سکول ماسٹروں کی طرح سوٹ پر کلاہ پہنتے ہیں اور دوسرے کبھی نہیں اتارتے۔ خواہ آپ شراب پی رہے ہوں۔ شوٹنگ کر رہے ہوں اور خواہ کسی ایکسٹرا لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے چھوٹے طبقے کے مسائل ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب آپ میکلوڈ روڈ کے ہوٹل میں تشریف لاتے ہیں تو لوگ جوق در جوق آپ کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور ہوٹل والا فوراً پرانے بل نکال کر کاؤنٹر پر سجا دیتا ہے۔

جناب کوڈے شاہ پاکستان بننے سے پہلے بمبئی میں رہا کرتے تھے۔ وہاں ایک فلمی سٹوڈیو کے لان کی گھاس کھودا کرتے تھے۔ بعدازاں آپ ڈائریکٹر گنجہ نند چٹو کے اسسٹنٹ بن گئے۔ آپ کا کام ایکٹروں کا لباس ٹھیک کروانا' سیٹ لگوانا' ہیروئن کو بار بار چائے پیش کرنا اور ڈائریکٹر گنجہ نند چٹو کی جھاڑیں اور گالیاں سننا تھا۔ دس سال آپ اسسٹنٹ رہے اور جب ایک فلم کا چانس ملا تو آپ نے اپنی قابلیت کا زبردست مظاہرہ کیا۔ ساری فلم غلط شوٹ ہو گئی اور جب نمائش کے لئے پیش کی گئی تو لوگوں نے کرسیاں توڑ دیں اور ڈائریکٹر پر جوتوں کی بارش کی۔ ایک جوتا گجانند چٹو کی کھوپڑی پر بھی آ لگا۔ چٹو صاحب نے بڑی زبردست گالی سناتے ہوئے کوڈے شاہ سے کہا۔

''کھوتے دے کھر۔ دس سال گدھے کو سکھایا ہوتا تو وہ تجھ سے بہتر فلم بناتا۔ مگر تم نرے کوڈے شاہ ہی رہے۔''

کوڈے شاہ کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ آپ فوراً پاکستان تشریف لے آئے اور یہاں آتے ہی ایک بلیک مارکیٹ میں کپڑا بیچنے والے کو پھانسا اور اس کے تعاون سے کوڈے شاہ لمیٹڈ کے نام سے فلم کمپنی سٹارٹ کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ کپڑا بیچنے والا بیوپاری صرف چھ گز کفن کا لٹھا بغل میں دبا کر فلم کمپنی کے دفتر سے بھاگ گیا اور سیدھا میانی صاحب پہنچ کر دم لیا۔ کوڈے شاہ نے

فوراً اپنے دفتر کو خباثت لمیٹڈ میں تبدیل کر دیا اور اس کاروبار میں ہزاروں روپے کمائے۔ اب کوڈے شاہ کو دو تین اچھی پارٹیاں مل گئیں اور انہوں نے باقاعدہ فلمیں بنا کر پاکستان کی خدمت کرنا شروع کر دی۔

آیئے قارئین اب آپ کی جناب کوڈے شاہ سے باقاعدہ ملاقات کرواتے ہیں اور آپ پر یہ راز فاش کرتے ہیں کہ کوڈے شاہ ملک کی خدمت کس طرح کرتے ہیں۔

کوڈے شاہ پروڈیوسر کے ہاں

جناب کوڈے شاہ کلاہ پہنے صوفے پر براجمان ہیں۔ پاسنگ شو کا سگریٹ ہاتھ میں سلگ رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ جیب سے بار بار پکوڑے نکال کر کھا رہے ہیں۔ موٹا بھدا گینڈے کی گردن والا پروڈیوسر صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور پوچھ رہا ہے۔

فلم کا نام کیا ہوگا جی؟

کوڈے شاہ: پھنے خاں حضور!

پروڈیوسر: (اچھل کر) بک بک نہ کرو جی۔ یہ تو میرا نام ہے!

کوڈے شاہ: گستاخی معاف حضور۔ تو پھر گامے شاہ رکھ لیتے ہیں۔

پروڈیوسر: (خوش ہو کر) ہائے جی! کتنا سہانا نام ہے اور سنو لڑکیاں کتنی ہوں گی؟

کوڈے شاہ: فی الحال تو صرف تین لڑکیوں کا کام ہے حضور۔

پروڈیوسر: آپ زیادہ لڑکیوں کو کام کیوں نہیں دیتے؟ آپ کو پتہ نہیں ملک میں بیکاری کتنی ہے۔ کم از کم ایک درجن لڑکیاں ضرور ہونی چاہئیں۔

کوڈے شاہ: بہت اچھا حضور! ایسا ہی ہوگا (فائل نکال کر) کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ (کوڈے شاہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھ فضا میں لہراتا ہے) طوفان گرج تھنڈرنگ کارجاری ہے۔ تھنڈرنگ کٹ کارجاری ہے۔ انٹرکٹ تھنڈرنگ کٹ جنگل کٹ۔

پروڈیوسر: ہیروئن کی عمر کتنی ہے جی؟

کوڈے شاہ: (اپنی جگہ پر بیٹھ کر پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے) یہ کوئی سولہ یا سترہ کا سن ہے۔ کولہے چوڑے ہیں کمر پتلی ہے۔

پروڈیوسر: اور آنکھیں؟

کوڈے شاہ: بڑی کیلی ہیں۔ ہاں تو کہانی یہاں سے ٹرن لیتی ہے اور کار ایک کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوتی ہے اور۔

پروڈیوسر: (قریب آ کر) ہیروئن رہتی کہاں ہے؟

کوڈے شاہ: شاہی محلے میں۔۔۔۔۔۔۔اب کار کھڑی ہو جاتی ہے اور اندر سے۔۔۔۔۔۔

پروڈیوسر: شوٹنگ رات کو ہوا کرے گی نا؟

کوڈے شاہ: جی ہاں اور اندر سے ایک نقاب پوش باہر نکلتا ہے اور ہیروئن کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

پروڈیوسر: (ڈر کر) ہائیں اور ہیروئین اندر اکیلی ہے۔

کوڈے شاہ: جی ہاں! بالکل اکیلی ہے اور سو رہی ہے اور ہم نے اسے اس طرح سلایا ہے کہ اس کی ابھری ہوئی چھاتیاں لحاف سے باہر ہیں اور چہرے پر ڈیڑھ سیر پاؤڈر اور آدھ پاؤ لپ اسٹک ہے اور ایک ران نیم برہنہ ہو کر پلنگ سے نیچے لٹک رہی ہے۔

پروڈیوسر: (کھڑا ہو جاتا ہے) بس بس کوڈے شاہ جی بس کرو لاؤ کنٹریکٹ فارم اور کل رسم بسم اللہ کر دو۔

کوڈے شاہ فوراً دوسری جیب سے فارم نکال کر پر کرتا ہے۔ پروڈیوسر پٹھے خاں اس پر دستخط کرتا ہے اور چیک بک نکال کر دو ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیتا ہے اور کان میں کہتا ہے۔

پروڈیوسر: کل ہیروئن کو بھی ساتھ لانا۔

کوڈے شاہ: ضرور جناب (جیب سے پکوڑا نکال کر منہ میں ڈالتا ہے)

اسی رات کوڈے شاہ ایک کمرے میں

کوڈے شاہ شراب کے نشے میں دھت تین بوتلیں پی کر اور خالی بوتلیں گھر بھجوا کر ایکسٹرا لڑکی کو بغل میں لئے بیٹھا ہے۔

کوڈے شاہ: منی جان! اب تمہارا چانس ہے پیاری۔ سالا پروڈیوسر پھنس گیا ہے۔ تمہارے پورے سولہ سین ہوں گے۔ فلم میں۔ سالی ہیروئن کو کٹ کر دوں گا۔ اپنی موٹی ناک کو دیکھ کر روتی رہے گی۔

منی جان: پیارے کوڈے شاہ! میں تم پر مرتی ہوں۔

کوڈے شاہ: میں بھی تم پر مرتا ہوں پیاری' ہمارا سارا خاندان تم پر مرتا ہے۔ (اچانک دروازہ کھلتا ہے اور ہیروئن غصے میں اندر داخل ہوتی ہے)

ہیروئن: (کوڈے شاہ کوکان سے پکڑ کر) کیوں او نا ہنجار عاشق اب منی جان سے عشق ہونے لگا۔

کوڈے شاہ: (ہاتھ جوڑ کر) معاف کر دو۔ وہ تو میری بہن ہے۔ بڑی بہن ہے' چھوٹی بہن ہے۔

ہیروئن: بتاؤ کتنے سین ہوں گے۔

کوڈے شاہ: چالیس:

ہیروئن: اور ناچ؟

کوڈے شاہ: چالیس!

ہیروئن اور گانے۔

کوڈے شاہ: چالیس (چیخ مار کر) آہ! تم ضرور میرا چالیسواں کروا کر رہو گی۔

(جب سے پکوڑا نکال کر کھاتا ہے)

کوڈے شاہ کا انگریزی فلم دیکھنے جانا

کوڈے شاہ نئی فلم کی کاغذی تیاریوں کے سلسلے میں اپنے میوزک ڈائریکٹر کیمرہ مین مکالمہ نویس اور گیت نویس کے ساتھ انگریزی فلم دیکھ رہا ہے۔ سکرین پر انگریز ہیرو اپنی ہیروئن سے اظہار عشق کر رہا ہے۔ کوڈے شاہ اپنے مکالمہ نویس کو جھک کر کہتا ہے۔

کوڈے شاہ: منشی ہابیل صاحب اس گورے کا سارے کا سارا مکالمہ نوٹ کر لو۔ اور ہاں اس سالی میم کے ڈائیلاگ پر بھی نظر رکھنا۔

منشی: بہت اچھا حضور!

منشی ہابیل فوراً جیب سے کاپی پنسل نکال کر انگریزی مکالموں کا اردو ترجمہ لکھنے لگتا ہے۔ دوسرے سین میں ہیروئن گانا گاتی ہے۔ گانا مصری طرز کا ہے۔ کوڈے شاہ میوزک ڈائریکٹر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

کوڈے شاہ: کیوں ماشٹر غائب دین! یہ پورا گانا کسی طرح قابو میں نہیں کر سکتے۔

غائب دین: (چٹکی سے بیڑی کا گل جھاڑ کر) کیوں نہیں حضور! یہ خاکسار کیا نہیں کر سکتا۔ اب تو افریقہ کے حبشیوں کے گانے قابو میں کیے جا رہے ہیں اور یہ تو مصری گانا ہے اور راگ دھنا سری میں ہے اور دوسرے کالے سے شروع ہو کر ساتویں کالے پر جا

کر ختم ہوتا ہے حضور۔سرکار یہ ولایت والے ہمارے سارا میوزک چرا کر لے گئے ہیں۔اب یہاں نہ بھرویں ملتی ہے اور نہ درباری اور نہ گوجری۔وہ زمن شہر کا ایک عطائی گویا تھا۔کیا نام تھا سالے۔ہاتھو ہاتھو۔

کوڈے شاہ: ہاتھو کا ساگ؟

غائب دین: حضور کی خیر ہو۔کچھ ایسا ہی نام تھا۔سالا ہمارے میوزک کی کاپی کرتا تھا۔

منشی: حضور مکالمہ ذرا فحش ہو رہا ہے۔

کوڈے شاہ: (اچھل کر) ضرور ضرور۔منشی تمہارے منہ میں گھی شکر۔مکالمہ اگر فحش ہو۔

منشی: مگر حضور وہ سنسر والے۔

کوڈے شاہ: ارے ان کو ہم خود سنبھال لیں گے اور پھر وہ جب فلم چل رہی ہوتی ہے تو سورہے ہوتے ہیں۔تم اپنا کام کے جاؤ۔

منشی: بہت اچھا حضور!

کوڈے شاہ جیب سے پکوڑے نکال کر کھا رہا ہے اور بڑے انہماک سے انگریزی فلم کا ایک ایک سین دیکھ رہا ہے۔ایک سین پر فوراً کیمرہ مین کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے۔

کوڈے شاہ: مستری مستری!

مستری: جی سرکار!

کوڈے شاہ: ایس ایس اینگل سے منی جان کر شوٹ کرنا۔یہ اینگل فوراً چرالو۔

مستری: حضور چرانا کیا ہے۔یہ اینگل تو پہلے ہی میرے دماغ میں تھا۔

کوڈے شاہ: شاباش! بس منی جان کے سارے سین اسی اینگل سے لینا۔مستری: لیکن حضور منی جان تو فلم میں مرجاتی ہے اور یہ اینگل تو صرف ہنستے ہوئے ہی۔

کوڈے شاہ: پھر کیا ہوا۔ہم لاش کو ہنستے ہوئے دکھائیں گے۔آخر لوگ ہنستے ہنستے نہیں مرجاتے۔تم فکر نہ کرو۔کوڈے شاہ نے بمبئی میں دس سال گھاس نہیں کھودی۔

کوڈے شاہ کا ریڈیو انٹرویو

فلم ''گامے شاہ'' کے سیٹ پر آج چہل پہل ہے۔آج رسم بسم اللہ ہے اور کوڈے شاہ نے پکوڑے منگوار کھے ہیں۔آپ نے نیلا کلاہ پہن رکھا ہے اور پاسنگ شو کے سگریٹ بار بار سلگا رہے ہیں۔ریڈیو والوں کا ایک آدمی مائیک ہاتھ میں لئے ان سے انٹرویو کر رہا ہے۔

اناؤنسر: تو کوڈے شاہ جناب کا اسم شریف ہے۔

کوڈے شاہ: جی ہاں۔خاکسار ہی کوڈے شاہ۔پاکستان کا مایہ نام ڈائریکٹر ہے۔

کوڈے شاہ: جی ہاں!

اناؤنسر: نام تو بڑا رومانی ہے صاحب۔

کوڈے شاہ: (آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچ کر) کوڈے شاہ بھی بڑا رومانی ہے۔ بھائی۔افسوس کہ اسے لوگوں نے پہچانا ہی نہیں۔

اناؤنسر: مگر آپ تو رونے لگے۔

کوڈے شاہ: میرا دل تو قوم کے درد سے لبریز ہے اناؤنسر صاحب۔ذراسی موٹر سائیکل گزر جائے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

اناؤنسر: اللہ اللہ آپ ہیں قوم کے سچے خادم۔بس قوم کو آپ ایسے ڈائریکٹروں کی ضرورت ہے۔اچھا یہ تو بتائیے کہ کہانی کیسی ہے؟

کوڈے شاہ: اس فلم کی کہانی اور مکالمے میں نے خود لکھے ہیں۔کہانی ایک قلی مسٹر گامے شاہ کے ارد گھومتی ہے۔

اناؤنسر: پھر:

کوڈے شاہ: بس گھومتی رہتی ہے۔

اناؤنسر: آخر کب تک جناب؟

کوڈے شاہ: تین گھنٹے تک۔

اناؤنسر: بہت خوب اچھا یہ آپ کا سیٹ تو بڑا خوبصورت ہے۔

کوڈے شاہ: یہ قلی گامے شاہ کا گھر ہے۔

اناؤنسر: لیکن یہ پیانو کس لئے رکھا ہے؟ قلی کے گھر میں پیانو؟

کوڑے شاہ: جی ہاں قلی کی لڑکی ایم اے پاس ہے۔

اناؤنسر: کیا ہر ایم اے پاس لڑکی کے لئے پیانو بجانا۔

کوڑے شاہ: اجی یہ فلمی پیانو ہے۔ صرف کھوکھا ہی ہے۔ لڑکی تو ہاتھ مارے گی۔

بجائے گا ماشٹر غائب دین اور پھر لوگوں کو بے وقوف بھی تو بنا تا ہوا۔

اناؤنسر: بہت خوب بہت خوب۔ آپ واقعی مایہ ناز ڈائریکٹر ہیں۔ اچھا یہ تو بتایئے آپ ہندوستان سے کیوں آ گئے؟ حالانکہ وہاں آپ دس بارہ سال سے تھے؟

کوڑے شاہ: کمال کرتے ہیں جی آپ! بھلا پاکستان کو ہماری ضرورت نہیں تھی۔ ہمارا فرض تھا کہ پاکستان آ کر اپنے ملک کی خدمت کریں۔

اناؤنسر: سبحان اللہ سبحان اللہ اچھا یہ بتایئے۔ آپ نے یہ لائن کیوں اختیار کی؟

کوڑے شاہ: جی دراصل بات یہ ہے کہ میں پہلے گھی کا کاروبار کرتا تھا اور پاکستان بننے سے پہلے فوجیوں کو گھی سپلائی کیا کرتا تھا۔ بعد میں (ذرا شرما کر) ہی ہی ہی۔

اناؤنسر: شرمایئے نہیں۔ شرمانے کی کیا بات ہے۔ بھلا سٹوڈیو میں شرم کیسی؟

کوڑے شاہ: جی بات یہ ہوئی کہ خاکسار نے مس پھلجھڑی کو دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ عشق کا کنستر کھل گیا اور میں بہتے ہوئے گھی پر سے پھسل کر فلم سٹوڈیو میں آ گیا۔

اناؤنسر: گھی بیچنے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟

کوڑے شاہ: پکوڑے بیچتا تھا۔ (جیب سے پکوڑا نکال کر) شوق فرمایئے۔

اناؤنسر: (پکوڑا منہ میں ڈال کر) خوب خوب پکوڑا تو مزیدار ہے۔

کوڑے شاہ: میں نے خود بنائے ہیں۔

اناؤنسر: خوب خوب۔ تو آپ یہ کام اب بھی کرتے ہیں؟

کوڑے شاہ: محض تفریحاً۔

اناؤنسر: یہ تو بتایئے کوڈے شاہ جی۔آپ کتنی فلمیں بنا چکے ہیں۔

کوڈے شاہ: بیس بنا چکا ہوں۔باقی چار سو رہتی ہیں۔

اناؤنسر: پھر کیا کریں گے؟

کوڈے شاہ: حج کرنے چلا جاؤں گا۔

اناؤنسر: سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا نیک خیال ہیں۔ماشا اللہ ماشا اللہ!

کوڈے شاہ: بس جی ہم تو آرٹ کی خدمت کرتے ہیں' اور روکھی سوکھی کھا کر' اچھی بری پی کر سو رہتے ہیں۔

اناؤنسر: واہ وا! واہ وا! اچھا جناب چیچو چیچ گنڈیریاں بھی آپ ہی کی فلم تھی۔

کوڈے شاہ: جی ہاں پنجابی فلم تھی' مذاقیہ تھی۔

اناؤنسر: پنجابی فلمیں مذاقیہ کیوں ہوتی ہیں صاحب؟

کوڈے شاہ: یہ بڑے راز کی بات ہے۔ذرا کان ادھر کریں۔

اناؤنسر: بہت اچھا (کان آگے کرتا ہے)

کوڈے شاہ: اس لے کہ پنجاب بڑا مذاقیہ ملخ ہے۔

اناؤنسر: (عش عش کر اٹھتا ہے) آہا آہا آہا آہا کیا معرفت ہے! کیا علم ہے! سبحان اللہ۔میں بھی کہتا تھا پنجابی بول کر آدمی خوش کیوں ہوتا ہے؟

کوڈے شاہ: یہ بات کسی کو بتائیں نہیں۔

اناؤنسر: اجی توبہ کیجئے۔اچھا جناب۔آپ کی فلم میں کتنی ہیروئنیں ہیں؟

کوڈے شاہ: ابھی تیسری کے لئے جگہ نہیں ملی۔بہر حال کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔اور اگر جگہ نہ ملی تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لیں گے۔

اناؤنسر: تو تیسری ہیروئن کا کام کیا ہوگا؟

کوڈے شاہ: وہی جو پہلی دو ہیروئنوں کا ہے۔یعنی لوگوں کو بے وقوف بنانا۔لیکن ہماری یہ تیسری ہیروئن ایک اور کام بھی کرے گی۔یعنی پہلی دو ہیروئنوں کو اپنے ہیروؤں سے ملنے نہیں دے گی۔

اناؤنسر: اور یہ کش مکش کب تک جاری رہے گی؟

کوڈے شاہ: جب تک فلم کی آخری ریل نہیں آجاتی۔

اناؤنسر: بہت خوب۔ کوڈے شاہ صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ واقعی آپ ملک کے مایہ ناز ڈائریکٹر ہیں۔ قوم آپ پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

کوڈے شاہ: آپ کی ذرہ نوازی ہے (پکوڑا نکال کر) شوق کیجئے۔

پیارے قارئین آیئے اب آپ کو فلم ''گامے شاہ'' کے چند مناظر دکھلائیں۔ جو پہلوان سٹیوڈیو میں زیر تکمیل ہے۔ ملاحظہ ہو فلم کا ساتواں منظر ہیرو اور ہیروئن ایک جھیل کے کنارے بیٹھے محبت کر رہے ہیں۔ ڈائریکٹر کوڈے شاہ سامنے کیمرے کے پاس کرسی پر بیٹھا پکوڑے نوش جاں کر رہا ہے۔

محبت کا منظر

ہیرو: (انٹر ہوتا ہے) اسلام علیکم مس منی جان!

ہیروئن: وعلیکم السلام' عزیز دین کہو بال بچے خیریت سے ہیں؟

ہیرو: شکر ہے پروردگار کا' جس نے یہ دن دکھایا بہار کا۔ تمہارے بچوں کا کیا حال ہے۔

ہیروئن: چھوٹے کو خسرہ نکل آیا ہے۔ بڑا ہسپتال میں ہے اور منجھلا چارپائی پر پڑا ہے۔

ہیرو: محبت کا کیا حال ہے؟

ہیروئن: پہلے سے زیادہ موٹی ہو رہی ہے۔ ذرا اوپر دیکھو پیارے وہ کاغذ کا بناوٹی چاند۔ یہ ٹہنیوں پر کاغذ کے پھول اور اس جھیل کا گندا پانی۔ ہم تم اور یہ کاریگر لوگ آہ۔

ہیرو: ذرا اور اوپر دیکھو۔ یہ آرک لیمپوں کی روشنی۔ چھت کے ساتھ لٹکتا ہوا بوریا اور اوپر لکڑی کی بالکونی پر بندروں کی طرح چڑھے ہوئے کالی کالی ٹانگوں والے لائٹ بوائز اور یہ ہمارے سامنے کیمرے کا کھلا ہوا منہ اور کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈائریکٹر کا گنجہ سر۔ آہ! ایسے سہانے وقت محبت کے پرنالوں میں جوش کیوں نہ آئے۔ منی جان!

ہیروئن: مجھے تم سے محبت ہے عزیز دین!

ہیرو: (ماتھے پر ہاتھ مار کر) آہ! محبت عزیز دین کی عزیزہ ہے منی جان محبت عشق کے سینما گھر کی سکرین ہے۔ محبت عشق کے

گرم حمام کی ٹونٹی ہے اور پروڈیوسر کے باغ کی مولی ہے۔

ہیروئن: مولی! تم نے مولی کا نام کیوں لیا پیارے مجھے تو آج مولیاں پکانی تھیں (ماتھے پر ہاتھ مار کر) یا اللہ۔ مولیاں! گانے لگتی ہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی۔

کوڈے شاہ (چیخ کر) کٹ بیڑا غرق کر دیا' میں نے تو گا جریں کہا تھا۔

ہیرو اور ویلن کا مقابلہ

ویلن: (تلوار سونت کر) ہاہاہاہا آج تم بچ کر نہ جاؤ گے۔ آج تمہیں موت کا لقمہ بنا کر چھوڑوں گا۔ آج تیرا بھٹہ ضرور بٹھا دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تیری ٹوپی کا لمبا پھندنا کوٹ کر سٹوڈیو سے باہر پھینک دوں۔

ہیرو: ہاہاہاہا اژدہام خاں! تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے۔ ایں خیال است محال است وجنوں است۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ اول تو تمہاری تلوار لکڑی کی ہے۔ دوسرے یہ ٹوپی اور پھندنا مانگ کر لایا گیا ہے۔

ویلن: (دل میں) ماشٹر چراغ دین! اب تم کیمرے کے سامنے ہو۔ یہ تمہارا سنہری موقعہ ہے جی بھر کر بولو۔ کڑ کڑ گرجو اور وہاں بیٹھے ہوئے بچوں کو ڈراؤ۔ خوب ڈراؤ۔ ڈائریکٹر خوش ہو گا اور تمہیں دوسری فلم کا بھی کنٹریکٹ مل جائے گا۔ (بلند آواز سے)

ہجوم خاں سنبھالو میرا وار۔

ہیرو: میں واری جاؤں تم وار تو کرو۔

ویلن: (بھرپور وار کرتا ہے) وہ مارا۔

ہیرو: ہاہاہاہا فتح آخر ہیرو کی ہو گی سالے۔ اس سینما میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ میرے ساتھ ہیں۔ تم اکیلے کیا کر لو گے۔ لو اب نیچے گر پڑو۔ تلوار چھوڑو ہاتھ سے جلدی۔

ویلن تلوار ہاتھ سے گرا کر نیچے گر پڑتا ہے۔

ہیرو: (تلوار ویلن کی چھاتی پر رکھ کر) وہ مارا۔ اب بتاؤ موت تمہارے سر پر کھڑی ہے۔

ویلن: موت جی! مجھے معاف کر دو۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں اور ہیروئن تمہارے حوالے کرتا ہوں۔

کوڈے شاہ: کٹ۔

پروڈیوسر: کوڈے شاہ جی! سیٹ پر آج ہیروئن دکھائی نہیں دے رہی؟

کوڈے شاہ: میک اپ روم میں بچوں کو دودھ پلا رہی ہے۔

جناب کوڈے شاہ کی فلم ''گامے شاہ'' ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ فنانسر بھاگ گیا۔ کوڈے شاہ کا پہلا فنانسر ایک مچھلی فروش تھا۔ یعنی کراچی میں مچھلیوں کا بزنس کرتا تھا۔ فلم کا پہلا اشتہار اس طرح تھا۔

حقیر بخش فقیر بخش مچھلی والوں کی

نرالی پیش کش

''راوی دا کھگا''

ملی مچھلی کی طرح اس فلم میں ایک بھی کانٹا نہیں۔

اس فلم کو دیکھے بغیر آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپیں گے۔

نوٹ: کراچی مچھلی کے تازہ کباب کھانے ہوں تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیں۔

جو دوسرا فنانسر ملا وہ اتفاق سے سنار تھا۔ اس نے اس طرح کا اشتہار دلوایا۔

چنن دین زرگر کی مینا کاری

''سونے دا کھگا''

دنیائے سینما پر سونا چاندی کی بارش

فلمی صنعت کا نولکھا ہار۔

پاسے کے سونے کی طرح اصلی اور سچی۔

نوٹ: نیز ماڈرن زیورات بنوانے کے لئے چنن دین زرگر بازار مائی سیون اندرون تیرہ ہٹی دروازہ ٹپ گراں سے رجوع کریں۔ سونے کا تازہ بھاؤ 800 روپے تولہ چاندی تھوبی 140 روپے سیر۔

جب فلم 12 آنے مکمل ہوئی تو زرگر فنانسر بھی رفو چکر ہو گیا۔ اب اس چکر میں سبزی منڈی کا ایک آڑھتی پھنستا ہے اور ''گامے شاہ'' کا اشتہار اخباروں میں اس طرح چھپتا ہے۔

حاجی خیر دین ٹینڈا پیش کرتے ہیں۔

ٹینڈے دا کھگا

ایک قلمی کی کہانی جو ہنڈیا میں اورک نہ ڈال سکا۔ جس کی گوبھی کو تڑکا نہ لگ سکا۔

فلمی دنیا میں سبزیوں ترکاریوں کی بہار، آلو ٹینڈے اور مٹروں کی بھرمار۔

سینما ہال میں سبزیوں کا خاص انتظام ہوگا اور ہر آدمی کو ٹکٹ کے ساتھ پیاز اور دھنیے کی گھٹی مفت ملے گی۔

فلم چودہ آنے تکمیل کو پہنچی تو حاجی خیردین ٹینڈا بھی سبزیوں ترکاریوں کی چھابری چھوڑ کر اٹھ بھاگا۔ کوڈے شاہ نے فوراً ایک مشہور پہلوان کو پھانس لیا۔ چنانچہ فلم کا چوتھا اشتہار یوں نکلا۔

گھٹیا پہلوان پری پیکر پسرور پہلوان کن پھٹا مکراں والا کی زوردار پیش کش

پاکستانی فلم انڈسٹری کو دھوبی پٹڑا۔

ہیرو ہیروئن کی کشتی اور ڈنگل کے خاص منظر

تماش بینوں کی سینما ہال میں تیل مالش کا خاص انتظام ہوگا۔

ٹکٹ کے ساتھ بادام اور چار مغز کی پڑیا مفت ملے گی۔

شور مچانے والوں کی گردنوں کے منکے توڑ دیئے جائیں گے۔

لیکن کوڈے شاہ کی بدقسمتی کی عین وقت پر گھٹیا پہلوان پری پیکر بھی اکھاڑے سے بھاگ نکلا اور فلم کا منکا ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ سب سے آخر میں ایک مشہور و معروف گورکن قابو آیا جس نے صرف یہ کہ فلم ''کھگے'' کو تکمیل تک پہنچایا بلکہ اشتہار بھی مختصر دیا۔

فلم انڈسٹری کے تابوت کی آخری میخ ''قبر دا کھگا''

سینما ہال میں اپنا اپنا کفن ساتھ لائیں۔

کچے گھڑے مفت سپلائی کیے جائیں گے۔

سینما ہال میں دم توڑنے والوں کے ساتھ خاص رعایت ہوگی۔

کہتے ہیں کہ جس روز فلم ''قبر دا کھگا'' ریلیز ہوئی۔ سینما ہال سے کئی لاشیں میانی صاحب پہنچائی گئیں اور سینما والوں نے ان کی ٹکٹ کے دام واپس کر دیئے۔ آج کل جناب کوڈے شاہ اسی گورکن کے پاس ہوتے ہیں۔ سال میں چھ فلمیں بنا رہے ہیں اور فلم انڈسٹری کے تابوت میں دھڑا دھڑ میخیں ٹھوک رہے ہیں۔

◆◆◆

قصہ آخری درویش کا

قارئین کرام! میں سلسلہ چہار درویشیہ کا آخری درویش ہوں۔یعنی حکایات چہار درویش کے تابوت کی آخری کیل ہوں۔اس سے پہلے کہ آپ لوگ یہاں سے اپنا بوریا بستر ہ باندھ کر کوچ کر جائیں۔آپ کو اس شہر زرنگار کا قصہ سنانا چاہتا ہوں جس کو اہل زبان عروس البلاد پاکستان اور اہل نظر لاہور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بھائیو! جس وقت میں بغیر ٹکٹ لاہور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا۔تو ایک ٹکٹ بابو نے میری طرف گھور کر دیکھا۔میں نے سوچا شاید یہاں کا دستور ہی ایسا ہے چنانچہ میں نے بھی ازراہ مروت اسے گھور کر دیکھا۔دونوں کی آنکھیں ملیں۔نظر سے نظر ٹکرائی اور دونوں گلے مل گئے۔ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔اس کے بعد معاشقہ اور ناشتہ کیا اور جدا ہو گئے۔ٹکٹ بابو نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچی۔

ٹکٹ میں نے ازراہ تفنن طبع نہیں خریدا تھا اور کچھ اس لئے بھی کہ پیسے نہیں تھے اور اس لئے پاس نہ رکھے تھے کہ ان کا خرچ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

صاحبو! یہ رات کا وقت تھا۔کوئی نصف شب کا عمل ہو گا۔نیند اور چوری کی آمد آمد تھی۔رات بسر کرنے کا فکر دامن گیر ہوا۔کارواں سرائے کی تلاش شروع کی۔مگر معلوم ہوا کہ اس شہر میں کارواں سرائے نام کی کوئی شے کہیں نہیں ہے۔البتہ ایسے ہوٹل ضرور ہیں۔جہاں مسافروں کو سلانے کی بجائے کھٹملوں بھرے لکڑی کے بنچوں پر بٹھلا کر سامنے حقے رکھ دیئے جاتے ہیں اور پھر ساری رات فلمی ریکارڈ سنائے جاتے ہیں۔کچھ دیر اس خاکسار نے بھی کھٹمل مارے حقہ پیا' فلمی ریکارڈ سنے اور سونے کے لئے حضوری باغ میں آ گیا۔یہاں بنچوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔لوگ بڑے مزے سے سو رہے تھے۔گھاس پر ایک جگہ اتنی زمین خالی تھی کہ پاؤں پسارے جا سکیں۔ابھی لیٹا ہی تھا کہ معلوم ہوا وہاں مجھ سے پہلے بڑے خونخوار قسم کے مچھر حضرات سو رہے تھے۔چنانچہ انہوں نے مجھ پر حملہ بول دیا۔رات بھر ان سے جنگ ہوتی رہی۔صبح ہوئی تو اس عاجز نے دیکھا کہ گھاس پر مچھروں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔اٹھ کر نلکے پر وضو کیا۔نماز پڑھی۔تسبیح کا ورد کیا۔مچھروں کی گنتی کی۔کل تین لاکھ دس ہزار ایک سو بانوے

تھے۔ سب مردہ تھے۔ صرف ایک مچھر زندہ تھا۔ زخمی ٹانگ پر زبان پھیرتے ہوئے مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اب جو ایک پرانی قسم کی گلی میں سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک حویلی کے اندر پنچائت لگی ہے۔ محلے کے بزرگ حضرات چارپائیوں پر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں تخت پوش بچھا ہے۔ جس پر ایک سفید ریش حضرت بڑا سا پگڑ باندھے تشریف فرما ہیں اور سامنے ایک ملزم کھڑا ہے جو بیان دے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ نے اومنی بس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت کو اچانک دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ ملزم اپنی صفائی میں کہہ رہا تھا۔

حضور! یہ عورت رنگ محل سے بس میں سوار ہوئی۔ اور میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جب کنڈیکٹر اس کی جانب آیا تو اس عورت نے اپنا بیگ کھولا۔ بیگ کھول کو بٹوا نکالا۔ بٹوا نکال کر بیگ بند کیا۔ بیگ بند کر کے بٹوا کھولا۔ بٹوا کھول کر پیسے نکالے۔ پیسے نکال کر بٹوا بٹوا بند کیا۔ بٹوا بند کر کے بیگ کھولا۔ بیگ کھول کر بٹوا اس میں رکھا۔ بٹوا رکھ کر بیگ بند کیا ہی تھا کہ کنڈیکٹر واپس چلا گیا۔ چنانچہ اس عورت نے پھر بیگ کھولا۔ بیگ کھول کر بٹوا نکالا۔ بٹوا نکال کر بیگ بند کیا۔ بیگ بند کر کے بٹوا کھولا بٹوا کھول کر

.... تخت پوش پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چیخ ماری۔

تم مجھے پاگل بنا دو گے۔

ملزم نے کہا۔ حضور میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

میرے بھائیو! جہاں میں کھڑا ہوں۔ وہاں میرے پاس ہی ایک موٹی سی خاتون بھی کھڑی تھی۔ اس نے ملزم کا بیان سن کر زیر لب خندہ کیا اور اپنا بیگ کھول کر بٹوا نکالا۔ بٹوا نکال کر بیگ بند کیا۔ بیگ بند کر کے بٹوا نکالا۔ بٹوا کھول کر اسے بند کرنے ہی والی تھی کہ میں چیخ کر وہاں سے بھاگ کھڑا۔ دوپہر کو اتنی شدید گرمی پڑی۔ کہ ایک چیل نے میرے سامنے گھونسلے سے باہر ہی انڈا چھوڑ دیا۔ میں اپنی لگن میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اچانک لو لگ گئی اور بخار ہو گیا۔ حسن اتفاق سے سامنے جو نظر پڑی۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ ایک بورڈ پر لکھا ہے۔

الحاج حکیم ملک الموت میانی صاحب والے۔ سند یافتہ

فوراً اندر پہنچا کورنش بجائی۔ دری بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ حکیم قبلہ ایک مریض کا حال دیکھ رہے تھے۔ آپ نے مریض کی کلائی تھام رکھی تھی اور زبان دیکھ کر فرما رہے تھے:

ارے تمہیں تو یرقان بھی ہے۔ زبان ایک دم پیلی پڑ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے گھٹنے میں ورم ضرور ہے اور اگر ورم نہیں تو خسرہ

ضرور نکلا ہوا ہے۔ ازاں بعد آپ نے مریض کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور فرمایا۔ اف تمہارے تو دانت بھی خراب ہیں۔ آنکھوں کو پائیوریا کی شکایت ہے۔ ''حکیم صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے اوپر ایک الماری میں ہر سائز کی انسانی کھوپڑیاں رکھی تھیں اور نیچے لکھا تھا۔

''ان خوش قسمت مریضوں کی کھوپڑیاں۔ جو شفا پا گئے۔''

اتنا پڑھنا تھا کہ قارئین کرام! یہ خاکسار وہاں سے اٹھا۔ کورنش کو اچھی طرح بجایا۔ دری کو لپیٹا اور پاؤں سر پر رکھے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ تیسرے پہر دل میں خیال آیا کہ ہندوستان کی ملکہ نور جہاں کے مزار کی بھی سیر کی جائے۔ چنانچہ یہ خاکسار وہاں جا پہنچا۔ فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد مجاور سے ایک کوئلہ لے کر دیوار پر ایک عبرت انگیز شعر لکھا اور باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے درختوں کے نیچے بنچ پر ایک جوڑے کو محو گفتگو پایا۔

بیوی: اگر میں مر گئی تو آپ کیا کریں گے سرتاج۔

خاوند: میں دیواروں سے ٹکریں ماروں گا۔

بیوی: ہائے میں مری۔ ایسا نہ کہیں۔

خاوند: میں تو پاگل ہو جاؤں گا بیگم اور کوئی تعجب نہیں کہ دوسری شادی بھی کر لوں

بیوی: کیا کہا؟ (غصے میں) دوسری شادی کر لو گے؟

خاوند: آدمی پاگل ہو کر کیا نہیں کر جاتا۔

صاحبو! اتنا سننا تھا کہ میں نے نور جہاں کے مزار پر ایک بار پھر فاتحہ پڑھی اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

رات کو ایک محفل مشاعرہ میں شرکت کا شرف نصب ہوا۔ جس وقت یہ خاکسار مشاعرے میں پہنچا۔ ایک منحنی سا شاعر لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کہ وہ بیٹھ کر شعر سنائیں گے۔ تو ہم کھڑے ہو کر شعر سنیں گے۔ مجبوراً شاعر بیچارے کو کھڑے ہو کر ہی شعر سنانے پڑے۔ آپ نے بلند آواز میں ترنم سے شعر پڑھنا شروع کئے۔ آپ کی آواز اس قدر باریک اور تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا سوئی میں سے دھاگہ گزر رہا ہے۔ آپ فرط اضطراب سے دہرے ہوئے جا رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ آپ بیٹھ کر کیوں شعر پڑھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف لاؤڈ سپیکر پر آواز اس قدر تیز تھی، پرسوز تھی کہ جو بھی لوگ سپیکر کے قریب بیٹھے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں اور ہر شعر پر جی کھول کر داد دے رہے تھے اور جو لوگ اندر بیٹھے تھے۔ ان تک صرف آواز پہنچتی

تھی۔ چنانچہ وہ صرف آواز ہی سن کر جھوم رہے تھے۔ آپ کے بعد ایک مرغ بادنما قسم کے شاعر صاحب تشریف لائے۔ آپ نے پہلے ایک درجن قطعات سنائے۔ پھر پانچ سو اشعار کی ایک مثنوی پڑھی۔ ازاں بعد ایک ٹھمری سنائی۔ پھر غزل اور نظم پڑھی اور جب مسدس سنانے کے لئے کاپی ڈھونڈنے لگے تو جن لوگوں میں کچھ طاقت باقی رہ گئی تھی۔ انہوں نے آپ کو زبردستی سٹیج پر سے گھسیٹ کر اتارا اور مشاعرے کے پنڈال سے باہر کھائی میں پھینک دیا۔ اتفاق سے رات ایک ہوٹل میں انہی "کم سخن" شاعر صاحب سے پھر ملاقات ہوگئی۔ آپ اٹھ کر گلے ملے۔ دیوان کھول کر سامنے رکھا اور مثنوی سنانی شروع کر دی۔ پہلے تو میں از راہ مروت چپکے سے سنتا رہا۔ پھر بور ہو گیا اور کان بجنے لگے۔ پھر دانت بھی بجنے لگے۔ میں نے بیرے کو آرڈر دیا کہ ہوٹل میں جتنی چائے اور پیسٹری موجود ہے لا کر اس شاعر کے آگے ڈال دی جائے۔ اس کے بعد میں وہاں سے چپکے سے کھسکا اور باہر ایک سائیکل پر پاؤں رکھ کر ہوا سے باتیں کرتا ہوا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ابھی میں نے سائیکل پر سے ٹانگ اٹھائی ہی تھی کہ کیا دیکھتا ہوں شاعر صاحب دیوان کھولے پیسٹری کا ٹکڑا ہاتھ میں لئے سائیکل کے پیچھے بیٹھے ہیں۔ میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو آپ لوگوں کے درمیان بیٹھا آپ کو یہ حکایت سنا رہا تھا۔

اس کے بعد درویش نے دیکھا کہ اس کی بات پر کوئی ہل جل نہیں رہا۔ اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ قصہ سننے والے بے ہوش چکے ہیں۔

◆◆◆

میری داستاں دراز نہیں

میں اسی گلی میں رہتا ہوں!

مجھے یہاں وارد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ بس یہی ایک دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ پہلے میں وادی کاغان کی ہری بھری چراگاہوں میں رہائش پذیر تھا۔ کیا ٹھنڈی ہوائیں تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر دوڑائیے تو سفید سفید برف جمی ہوئی ہے۔ بادلوں کے قافلے ہیں کہ خراماں خراماں سبز ڈھلوانوں پر اترے چلے آرہے ہیں۔ انہی برف پوش ڈھلوانوں پر کبھی اپنا مسکن تھا۔ جب وہ پیارے وطن کے مناظر یاد آتے ہیں تو دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ اب تو لو میں جھلسے خاک اڑاتے 114 ڈگری والے لاہور کی فضا ہے اور یہ خاکسار ہے۔ اپنا ٹھکانہ مصری شاہ کی اس دھول اڑاتی گلی کے نیم کے درختوں تلے ہے۔ ماشٹر فیروز دین درزی مجھے یہاں لایا ہے۔ میری پیاری امی بھی میرے ساتھ اسی گلی میں اپنی عمر عزیز کے باقیماندہ دن پورے کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر گلی کے دوسرے سرے پر بیری کے درخت تلے دن بھر بیٹھی کاغان کی وادی میں گزری ہوئی جوانی کے دنوں کو یاد کیا کرتی ہے۔ کبھی کبھی میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ لیتی ہے اور بڑے دکھ بھرے انداز میں مجھے آواز دے کر خاموش ہو رہتی ہے۔

ماشٹر فیروز دین درزی میری بڑی خبر گیری کرتا ہے۔ مجھے اپنی نگاہوں سے ایک پل کے لئے بھی اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ سارا دن مجھے گلی میں نیم کے پیڑ تلے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہے۔ ماشٹر کی دکان اپنے مکان کے نچلے کمرے میں ہے جہاں وہ سارا دن کپڑے سیا کرتا ہے۔ ہر دس منٹ کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر کھنکارتا ہے اور پچکاری بھر کر پوچھ لیتا ہے۔ ''کیوں بھئی مولوی عمردین مزے میں ہو نا!''

مولوی عمر دین میرا نام درزی مالک نے رکھا ہے۔ مجھے یاد ہے جس روز وہ مجھے دلی دروازے سے اپنے ساتھ مصری شاہ لایا تھا اس نے اپنے دوست علی بخش وثیقہ نویس سے کہا تھا۔ ''علی بخشا! اس سالے کی ڈاڑھی بالکل مولوی عمر دین کی طرح ہے۔'' بس اسی لمحے میرا نام عمر دین پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ماشٹر کے چھوٹے لڑکے نے ایک دن مہندی گھول کر میرے جسم پر ایک طرف عمر دین اور

دوسری طرف ''عید مبارک'' لکھ دیا۔

مجھے دن میں کئی بار کھانے کو ملتا ہے۔ویسے چنے کی دال کی کڑاہی اور پانی کی ٹھلیا ہر وقت میرے سامنے درخت تلے پڑی رہتی ہے۔جس میں سے کبھی کبھی بستے گوجر کی بھوری بھینس آتے جاتے منہ مار لیتی ہے۔ میں اسے منع نہیں کر سکتا۔صرف اندر سے میرے مالک کی آواز بلند ہوتی ہے۔'' ہے! ہے!! دفعہ ہو جا ہے ہے!!'' اور اس کے ساتھ ہی ایک عدد جوتا بھی اندر سے باہر اچھالا جاتا ہے۔ یہ بھوری بھینس کے بجائے ہمیشہ میری پیٹھ پر آ کر لگتا ہے۔ ماسٹر فیروز دین قربانی وغیرہ کا قائل تو ہے مگر ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے اس کا خیال تھا کہ اب کی بار قربانی دینے کی بجائے قربانی کا گوشت کھا کر گزارہ کیا جائے۔مگر اس کی جھگڑالو بیوی نے اعلان کر دیا کہ اگر اس دفعہ قربانی نہ دی گئی تو اس کی ناک کٹ جائے گی اور وہ مصری شاہ کے دو موریا پل سے چھلانگ لگا کر اپنی دونوں ٹانگیں تڑوا لے گی۔ ماسٹر بے چارہ جو بیوی سے دبتا ہے بے حد پریشان ہو گیا۔ چارو ناچار اس نے اپنے وثیقہ نویس دوست سے پچاسی روپے قرض لئے اور اسے ساتھ لے کر دلی دروازے کے باہر سے مجھے خرید لیا۔

میری امی جان کو مسمی محمد علی نابنائی نے میرا سودا ہو جانے کے آدھ گھنٹہ بعد خریدا۔ میں تو بڑا روتا ہوا اپنی ماں سے جدا ہوا تھا لیکن آدھ گھنٹہ بعد جب میں نے اسی گلی کے آخری سرے پر اپنی ماں کی درد بھری ''مے مے'' سنی تو دل سینے میں بلیوں اچھلنے لگا۔ شکر ہے خدا کا کہ اپنی پیاری ماں کا پھر سے دیدار نصیب ہوا۔محمد علی نابنائی میری ماں کو ہر روز کھنڈ قلچے اور پیڑے کھلاتا ہے۔ میری ماں رات رات بھر مجھے پکارتی رہتی ہے۔ میں بھی اس کی آواز کا برابر جواب دیتا رہتا ہوں جس کی وجہ سے اس گلی کے باسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ہے۔ مگر صاحب کیا کیا جائے۔ آپ جانتے ہیں ماں بیٹے کا رشتہ کتنا زبردست ہوتا ہے۔ایک دو بار تو ماسٹر فیروز دین نے سوتے میں اٹھ کر جوتے سے میری پٹائی بھی کی۔ مگر میں باز نہ آیا۔ ماں کی آواز پر خود بخود سینے سے بھرائی ہوئی ''مے مے'' کی پکار نکل ہی گئی۔

جب ہمیں پہلے پہل یہاں لایا گیا تو ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کاغان کی وادی سے محض تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے لاہور لایا جا رہا ہے۔ میرے جتنے بھی دوست تھے میرے ساتھ تھے۔دلی دروازے کے باہر والے باغ میں پوری رات ہماری آپس میں اس مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر متفق رائے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارا مالک ہمیں لاہور کی سیر کروانے اور' ہم دیہاتی لونڈوں کی فلمیں دکھانے' میکلوڈ روڈ کی سیر کروانے اور ذرا شہر کی ماڈرن زندگی سے روشناس کروانے کے لئے لایا ہے مگر دوسرے دن جب ہماری سودے بازی ہونے لگی اور لوگوں نے گز گز بھر کے ہاتھ ہماری پسلیوں میں گھسیڑ گھسیڑ کر ہمیں ٹٹولنا شروع کر دیا اور

سارے ریوڑ میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔فوراً خیال آیا کہ کچھ عرصہ ہوا اسی طرح ہمارے ساتھ والے گاؤں میں سے کچھ دوستوں کو ہنکا کو شہر لے جایا گیا تھا اور آج تک اس کی خبر نہیں مل سکی کہ انہیں آسمان کھا گیا' زمین کھا گئی یا لوگ کھا گئے۔

بہر حال اب ہمارا انجام ہمارے سامنے تھا۔ایک ایک کر کے جدا ہونے لگے۔آج یہ کل وہ پرسوں میں۔میرے کچھ دوست ساتھ والے محلے میں بھی آئے میرے دوست اگر بادل ناخواستہ آئے تو انہیں خریدنے والوں میں سے اکثر نے انہیں بادل ناخواستہ خریدا ہے۔یعنی قربانی کے مقدس جذبے کے خیال سے کم اور محلے میں عزت داری اور اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے خیال سے زیادہ۔!

مثلاً میں جانتا ہوں کہ کرم دین حلوائی کے پاس پیسے کم تھے اور اس نے بیس روپے حاکم علی پٹواری سے قرض لئے تھے۔محکم دین عرائض نویس کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہ تھی۔مگر محلے میں اپنی عزت قائم رکھے گا۔اگر اب کے قربانی نہ دی۔ایک کاغانی یا بہاولپوری دنبے کو ذبح کر کے اس کا گوشت گھر گھر نہ بانٹا گھر گھر اس کی قربانی کا پیغام نہ پہنچا تو اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔محلے والے کہیں گے محکم دین مفلس ہو گیا ہے' اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔بس ظاہری ٹیپ ٹاپ رہ گئی ہے۔مرزا ہدایت اللہ ہیڈ کلرک کی ساری رات اپنی بیگم سے لڑائی ہوتی رہی ہے۔مرزا کہتے تھے کہ میں قرض لے کر قربانی نہیں کروں گا۔یہ شرعاً بھی جائز نہیں۔بیگم کہتی تھی کہ قرض لو یا چوری کرو۔مگر قربانی ضرور کریں گے۔اگر قربانی نہ کی تو محلے والے کیا کہیں گے۔چنانچہ مرزا صاحب نے بیگم کی بالیاں گروی رکھ کر روپیہ حاصل کیا اور میرے ایک پرانے دوست کو بکر منڈی سے خریدا اور اپنے گھر کے باہر باندھ لیا۔اب وہ ساری ساری رات ہاں ہاں کرتا مرزا جی کی قربانی کا اعلان کیا کرتا ہے۔بیگم اس کی آواز سنتی ہے اور جی ہی جی میں یہ سوچ کر خوش ہوتی ہے کہ لوگ ہر گھڑی ان کی قربانی سے باخبر ہو رہے ہیں۔اس محلے کے لونڈے بڑے شرارتی ہیں۔مجھے بہت کم آرام کرنے دیتے ہیں۔کوئی آ کر میری زنجیر کھینچتا ہے۔کوئی وال کی کڑاہی کھینچ کر دور رکھ دیتا ہے۔کوئی میری ناک میں چھڑی گھسانے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی میرے مالک کی نظر بچا کر میرا کان کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔

جو لوگ قربانی نہیں دے رہے وہ مجھے صبح و شام گھورتے ہوئے گزرتے ہیں۔انہوں نے اپنی اپنی پسند کا گوشت منتخب کر لیا ہے۔مثلاً مولوی قدرت اللہ کی خواہش ہے کہ اسے میری گردن کا گوشت ملے۔رحمت علی ماچھی نے میرے سینے پر نظر رکھ چھوڑی ہے۔فتح دین قلی کا خیال ہے کہ ران کا گوشت مل جائے تو دو روز تک برابر چلے۔مولوی قدرت اللہ نے تو ایک روز میرے مالک سے باتیں کرتے ہوئے پیار کرنے کے بہانے میری گردن کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ بھی لیا اور اطمینان کر لیا کہ چربی وافر موجود

ہے۔ ہنڈیا میں گھی ڈالنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

فتح دین نے ایک روز میری ران پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اپنا اطمینان کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ایسی چھڑ ماری کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

محلے کا حکیم ان دنوں بہت خوش نظر آتا ہے۔ کیوں نہ ہو اسے معلوم ہے عید کے بعد ہفتہ بھر تک پیٹ درد اور بدہضمی کی دوائیں ہاتھوں ہاتھ بکیں گی۔ ہم تمام دوستوں نے آپس میں طے کر رکھا ہے۔ کہ قربان ہونے کے بعد لوگوں کے معدوں میں جا کر کہرام بپا کر دیں گے۔ ان کا انجر پنجر ڈھیلا کر دیں گے۔

جس آدمی کی نگاہوں سے بلکہ اس کے قدموں کی چاپ ہی سے میرے بدن پر لرزا طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس محلے کا قصاب ہے۔ وہ بھی ہر روز گلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے گھور گھور کر دیکھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی پیار سے پچکارتا بھی ہے۔ ظالم میں تیرے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں مجھے اس وقت بے اختیار اپنے ایک شاعر دوست حضرت مینڈھا کا غانی کا شعر یاد آ رہا ہے۔

پہلے تو محبت سے یوں پاس بلاتے ہیں
پھر چپکے سے گردن پر خود چھری چلاتے ہیں

میری ماں بے چاری کب تک میری خیر منائے گی۔ عید سے ایک روز پہلے میرا مالک میرے اوپر گوٹ لگی کیسری چیز ڈال کر گردن موتیا کے پھولوں سے لاد کر بھاٹی دروازے کی سیر کرائے گا۔ وہاں باغ میں اپنے کئی ایک پرانے دوستوں سے ملاقات ہو گی۔ آخری ملاقات کسی کی پسلیوں پر مالک کا نام مہندی سے لکھا ہوگا۔ کسی پر "یہ قربانی کا بکرا ہے۔" رقم ہوگا اور کسی پر "پاکستان زندہ باد" ابھی پرسوں کی بات ہے۔ میرا مالک مجھے سیر کروانے باغ میں لے گیا۔ وہاں میں نے ایک بہاول پوری بکرا دیکھا جس پر مہندی سے "دلیپ کمار" لکھا تھا مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر میرا مالک بہت خوش ہوا۔ وہ خود بھی ہنسنے لگا۔

پرسوں عید ہے۔ بچے خوش ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹروں اور قصائیوں کے وارے نیارے ہیں۔ قصائی چھریاں تیز کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مکسچروں کے جھجھر بھر بھر کر قرینے سے لگا رہے ہیں۔ میں اپنے گوشت کو گھر گھر بٹتا دیکھ رہا ہوں۔ سری کہیں جا رہی ہے پائے کہیں جا رہے ہیں۔ کھال کہیں جا رہی ہے۔

"سر بدست دیگرے دست بدستے دیگرے"

میرا مالک مجھے ہر روز صبح کو بھاٹی دروازے تک پھیلے ہوئے باغ میں سیر کروانے لے جاتا ہے۔ سیر سے واپسی پر میں جگہ جگہ

دیواروں پر لگے ہوئے اشتہار بخوبی پڑھ لیتا ہوں۔ اگر چہ میری نظر یہاں آ کر کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ تاہم یہ اشتہار کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان کی سرخیاں میری آنکھوں سے نہیں بچ سکتیں۔ کیونکہ ان سرخیوں میں مجھے اپنے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چند ایک سرخیاں ملاحظہ ہوں۔

’’اپنی قربانی کی کھالیں یتیم خانہ کو دیں۔‘‘

’’آپ کی کھال قوم کی امانت ہے‘ اس پر صرف امانت ہائی سکول کا حق ہے۔‘‘

’’یہ کھال کہاں لئے جا رہے ہیں؟ اسے مغل مسجد کے باہر لگے ہوئے خیمے میں جمع کروایئے۔‘‘

’’لایئے! یہ کھال کہاں لے جا رہے ہیں۔‘‘

ان سرخیوں سے یہ بات کہیں بھی پوری طرح نہیں ہوتی کہ اشتہاروں میں قربانی کے بکروں کو مخاطب کیا گیا ہے یا ان کے مالکوں کو! مجھے اپنی کھال کا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا ہے۔ خدا جانے یہ کس خیمے میں جائے گی۔ اس پر کون اپنا حق جمائے گا؟ میری دلی بلکہ آخری خواہش بس اتنی سی ہے کہ میری کھال یتیم خانے والوں کو بے شک دلوا دی جائے۔ لیکن قوم کی امانت حاصل کرنے والوں کو اس کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے وہ اسے بیچ کر ایک نیا حقہ خرید لیں گے۔ میں یہ پوائنٹ ذبح ہونے سے پیشتر فیروز دین ٹیلر ماشٹر کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

اب جب کہ زندگی کے چند آخری ایام لاہور کے اس محلے کی اداس گلی میں نیم کے پیڑ تلے پڑے پڑے بسر کر رہا ہوں تو مجھے اپنی محبوبہ پیارے پیارے سیاہ سینگوں اور کنچوں ایسی ہلکی نیلی آنکھوں والی بکری جان بہت یاد آتی ہے۔ ہماری آخری ملاقات وادی کاغان کے ایک پہاڑی چشمے پر ہوئی تھی۔ ہم کتنی دیر تک وہاں پیاری پیاری باتیں کرتے اور چشمے کنارے اگی ہوئی ہری بھری گھاس چرتے رہے تھے۔ اگلے ماہ ہماری شادی ہو رہی تھی۔ ہم نے شادی کے بعد پہاڑ کی دوسری جانب والی وادی میں جا کر ہنی مون منانے کا بڑا شاندار پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر وہ سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میں دوسرے روز منہ اندھیرے ہی ریوڑ کے ساتھ ہنکا کر شہر کی بڑی منڈی میں لے جایا گیا۔ جہاں سے ہمیں ٹرکوں پر لاد کر شہر کی بکر منڈی میں پہنچا دیا گیا۔ خدا جانے میری بکری جان کس حال میں ہو گی۔ میں تو اب اس ستم ظریف دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ یقیناً میرے بعد میری پیاری محبوبہ پر پھر پرانا پاپی کالی داڑھی والا کاغانی بکرا ڈورے ڈالے گا۔ بکری جان کب تک میرا انتظار کر سکتی ہے۔ ایک نہ ایک دن وہ سر تسلیم کالے کاغانی بکرے کے آگے خم کر دے گی اور وہ بدبخت بدرواسے بیاہ کر لے جائے گا۔ کیا وہ ہنی مون منانے ساتھ والے پہاڑ کی وادی

میں جائیں گے۔ہائے اس تصور ہی سے دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں۔لوگ ہمیں جانور سمجھتے ہیں۔مگر شاید انہیں معلوم نہیں کہ ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔جو اپنی محبوبہ کی آواز سن کر خوشی سے اچھلنے لگتا ہے اور اس سے جدا ہو کر اندر ڈوبنے لگتا ہے۔

اچھا بکری جان! الوداع!!!! اس جنم کا میل ملاپ تو ختم ہوا۔شاید کسی اگلے جنم میں ملاقات ہو۔بنو قصائی مجھے گھورتا ہوا میرے قریب گزر گیا ہے۔

◆◆◆

بپھری موجیں

ہیلو! جی ہاں۔ میں راوی برج سے بول رہا ہوں' لکھئے پانی کی روگٹی بتی فٹ پر سیکنڈ۔ اخراج ڈیڑھ لاکھ کیوسک۔ جی؟ جسڑ کی گیج؟ جی وہ منظور سمیع لکھواتا ہے۔"

راوی برج کے نیچے ایک کمرے اور ایک برآمدے والے ایریگیشن دفتر کے باہر بیٹھے ہوئے کلرک کو ہر منٹ کے بعد فون پر اسی قسم کے جواب دینے پڑتے تھے۔ سامنے دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سردیوں کی دوپہروں کو پر خور کاہل اژدھے کی طرح لیٹے رہنے والا راوی بارش کے پہلے چھینٹے پر ہی ایک خوفناک چیخ کے ساتھ دم جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دانت کٹکٹاتا' نتھنے پھلاتا۔ دندناتا' پھنکاریں مارتا' کھیتوں جھونپڑیوں' مکانوں اور دیہات کے کچے گلی کوچوں میں گھس گیا تھا۔ جگہ جگہ بند مار کر پشتے باندھ کر نہریں کھود کر اس اژدہے کی تباہ کاریوں کو روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ فوجی جوان اور محکمہ پی ڈبلیو ڈی کا عملہ ٹوٹی ہوئی سڑکوں کی مرمت ریلوے لائن کی دیکھ بھال اور عارضی پلوں کی تعمیر میں ہمہ تن مصروف تھا۔ راوی برج کے عین وسط میں سیلاب کا پانی قیامت خیز تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی پھونس کا چھپر یا کسی مسمار شدہ چھت کا سیاہ شہتیر طوفانی لہروں پر اچھلتا پھسلتا گھومتا بجلی۔ جیسی تیزی کے ساتھ گزر جاتا۔ ہمارے پاس ہی کنارے والی ملاحوں کی جھونپڑی کمر تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کا آدھ کھلا دروازہ لہروں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے شیشم کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے زندہ دلان لاہور ہاتھ کے اشاروں سے ایک دوسروں کو پانی کی روانی اور تباہی کا نظارہ کروا رہے تھے۔ جب ہم راوی کے پل پر گزر کر دوسری طرف آئے تو بائیں جانب ترکاریوں کے کھیتوں میں سیلاب کا پانی بھر چکا تھا اور پھٹے ہوئے گلے سڑے کدو یہاں وہاں پھولی لاشوں کی مانند تیر رہے تھے۔ کھیتوں میں ایک جھونپڑی مٹی کی ایک ڈھیری پر ابھی تک سلامت کھڑی تھی۔

اس جھونپڑی کے رہنے والوں نے اپنا سارا سامان نکال کر باہر جھلنگا سی چارپائی پر ڈال رکھا تھا اور ایک میلے کچیلے کپڑوں والی بوڑھی عورت نیلے رنگ کی چھیتڑا ایسی شلوار کو جھاڑ کر جھاڑیوں پر پھیلا رہی تھی۔

کامران کی بارہ دری کا ڈھانچہ دریا کی طرف جھکا ہوا تھا اور سیلاب کا پانی درانتی کی طرح اس کی بنیادوں کو کاٹتا چلا جا رہا تھا۔

بارہ دری کی طرف جانے والی سڑک دوسرے فرلانگ پر جا کر پانی میں ڈوب گئی تھی۔ دو ایک دیہاتی سامنے کی جانب سے دھوتیاں اوپر اٹھائے ڈانگوں پر جوتے لٹکائے قدم قدم پانی میں آرہے تھے۔

شیخوپورہ روڈ صرف ہیوی ٹریفک کے لئے کھلی تھی۔ دونوں جانب سے کارخانوں میں پانی داخل ہو چکا تھا۔ چوک میں پولیس اور فوج کی لاریاں کھڑی تھیں۔ وائرلیس پر چاروں طرف متعلقہ حکام کو سڑکوں کی صورت حال سے باخبر رکھا جا رہا تھا۔ فضا میں دریائی مٹی اور پانی میں ڈوبے ہوئے درختوں کی گیلی بو اور گندا بیروزا اور تارپین کی بدبو پھیلی ہوئی تھی' جو دھوپ' گرمی اور حبس میں اضافہ کر رہی تھی۔ شیخوپورہ روڈ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک مزدور ریڑے پر بجلی کا گرا ہوا کھمبا لائے چلا آرہا تھا۔ مسافروں سے لدی ہوئی بس پانی کو چیرتی سڑک پر چلی آرہی تھی۔ ایک بس شاہدرہ چوک میں پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ جس کے مسافر باہر نکل کر دریا کے پانی کا تماشا کر رہے تھے اور سگریٹوں والی دکان پر کھڑے سیلاب کی صورت حال پر تبصرہ وغیرہ کر رہے تھے۔ کپڑے کے ایک تاجر نے چوک کی ریلنگ کے جنگلے پر گیلی وائل کے چھاپ دار تھان سکھانے کے لئے پھیلا رکھے تھے۔ بڑھئی کی ایک دکان پر آرا مشین آدھی پانی میں ڈوب گئی تھی۔ ایک لڑکا پانی میں ہاتھ ڈال ڈال کر لکڑی کی چورس کھپچیاں نکال رہا تھا۔

شاہدرہ سے گوجرانوالہ جانے والی سڑک بالکل صاف تھی۔ صرف بائیں جانب سڑک اور مکانوں کے درمیان کچے راستے پر پانی پھیلا ہوا تھا۔ پانی دوسری جانب سے مار کرتا ہوا ادھر آرہا تھا۔ چنانچہ اکثر محلوں میں لوگ پرلی گلی کوچوں کے دروازوں پر مٹی اور بجری ڈال کر بند باندھنے میں مصروف تھے۔

شاہدرہ ریلوے سٹیشن کے پھاٹک پر جہاں سے ریل کی پٹڑی شیخوپورہ کی طرف کٹتی ہے۔ اونچے نکاس والی ایک نہر بھی نکلتی ہے۔ یہ نہر مین لائن والے پل پر اپنا کنارا توڑ بیٹھی تھی۔ جس کی وجہ سے سیلاب کا پانی داخل ہو کر ٹھاٹھیں مارتا جھاگ اڑاتا' شور مچاتا گزر رہا تھا۔ اس نہر کا ایک کنارہ صرف ایک اینٹ اونچی دیوار تھی۔ جس پر سے گزر کر ہمیں لائن پار والی بستیوں کی خبر لانی تھی کہ سیلاب نے انہیں کس حد تک متاثر کیا ہے۔ میں بڑا بہادر آدمی ہوں۔ اخروٹ مٹھی میں دبا کر توڑ لیتا ہوں۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا سکتا ہوں۔ آگ کا گولہ منہ میں لے کر بجھا سکتا ہوں۔ لیکن یقین کیجئے جب اس ایک اینٹ کی اونچی دیوار پر سے گزرنا پڑا اور نیچے دونوں جانب سیلابی سمندر کی چکراتی' کناروں سے ٹکرا کر جوش کھاتی پاگل' شوریدہ سر لہروں کا نظارہ دیکھا تو سر چکرا گیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں' ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں اپنی بہادری کے زعم میں آگے آگے تھا۔ میرے پیچھے قیوم آرہا تھا۔ وہ میری حوصلہ مندی کے سہارے چلا آرہا تھا اور میں اپنی ٹانگوں کے سہارے چل رہا تھا۔ جواب کانپنے لگیں

تھیں۔ خدا خدا کر کے یہ بیس گز کا فاصلہ طے ہوا اور میں چھلانگ لگا کر ریلوے لائن پر جا چڑھا۔ میں نے دیکھا میرے پیچھے قیوم بھی رومال سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

ریلوے لائن کے پار ہر طرف پانی کھڑا تھا۔ کھیت کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہاں وہاں کچھ پکے مکان تھے۔ جن کے مکین چھتوں پر سائیکل اور دوسرا سامان رکھے چار پائیاں کھڑی کئے' ان پر کھیس ڈالے سائے میں بیٹھے کھانا وغیرہ پکا رہے تھے۔ ایک آدمی سر پر پوٹلی رکھے۔ دوسرے ہاتھ سے خالی گھڑا اٹھائے سیلاب کے پانی میں گردن تک ڈوبا آہستہ آہستہ سامنے والی بستی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ یہ بستی درختوں کے جھنڈوں کے درمیان دوپہر کی تیز دھوپ میں ایک جزیرے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ کچے کوٹھوں پر لوگ چار پائیاں صندوق اور جلانے کی لکڑیاں ڈال رہے تھے۔ پھاٹک کے پاس چوکیدار کی کٹیا کے ارد گرد کرم آباد برکت ٹاؤن اور انی والا کھوہ کے قریبی دیہات سے آئے ہوئے لوگوں نے عارضی جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ کہیں آٹا گوندھا جا رہا تھا کہیں کوئی چاندی کی ڈنڈیوں والی عورت اپنی دادی کا سر گوندھ رہی تھی۔ کہیں ننگ دھڑنگ کالے کالے بچے ریلوے لائن کے چمکیلے پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ ایک ضعیف بوڑھا کھڑی چار پائی کے سائے میں کھاٹ پر لیٹا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک مسجد بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جس کے مینار پر ایک فاختہ بیٹھی بڑی اداس لے میں بول رہی تھی۔ دور سے پانی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''شاں....... ساں''

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دور کوئی مال گاڑی کسی پل پر سے گزر رہی ہے۔ اور مسلسل گزر رہی ہے۔ جب ہم ان بچوں بوڑھوں کی تصویریں لینے لگے تو ایک عورت نے ڈوپٹے سے ناک پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا:

موُرتیں لینے آجاتے ہو بابو جی۔ کبھی ہمارے دکھ درد کا علاج بھی سوچا ہے؟ ایک ادھیڑ عمر کا خشخشی داڑھی والا آدمی ہنستا ہوا ہمارے پاس آکر بولا' پہلے بھی ایک باؤ میری مورت اتار کر لے گیا ہے۔ پر اس نے میری مورت مجھے نہیں دی۔

یہ خوش مزاج آدمی اس دفعہ پھر تصویر اتروانے جھونپڑی کے باہر کھڑا ہو گیا اور آٹے کا کنستر ہاتھ میں لئے ہماری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پھاٹک کی دوسری جانب کچھ دیہاتی چار پائی پر اور زمین پر درخت کے سائے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور ہیر وارث شاہ پڑھ رہے تھے۔ مجھے ایک آدمی کے ہولے لمبی اداس لے میں ہیر پڑھنے کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کتاب بند کر دی۔

علیک سلیک ہوئی چارپائی پر ہمیں بٹھلایا اور بڑی خاموشی سے حقہ پینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ان لوگوں کو ہماری قیمتی پتلونوں' بوسکی کی قمیضوں اعلیٰ سگریٹوں اور روزانہ باقاعدگی سے شیو کئے نکور شہری چہروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جیسے ہم اس درماندگی میں ان کی تصویریں لینے نہیں بلکہ ان کا مذاق اڑانے وہاں آئے ہوں۔ میلی دھوتی اور پتلون پھٹے ہوئے پاؤں اور ہیوی کریپ سول میں جو بنیادی فرق ہوتا ہے۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے ہمیں بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایک طرح کی ندامت کا احساس ہونے لگا۔ جیسے ان کی بدحالی اور پریشانیوں کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ جیسے میں نے ہی ان کی قمیض پھاڑ کر اپنی جیب کا رومال بنایا ہے۔ جیسے میری کمر کے گرد لپٹی ہوئی پیٹی اسی چمڑے کا حصہ ہے۔ جس کا جوتا یہ دیہاتی نہیں پہن سکے۔ ہماری ہر بات کا جواب وہ بڑے مختصر الفاظ میں دیتے اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ تیز دوپہر اداسی' دھوپ' سیلاب کے پانی کی درد انگیز آواز' حبس ان لوگوں کی بے مہر خاموشی' فاختہ کی غمگین آواز میرا جی چاہا کہ سر پر روٹی اور بغل میں خالی گھڑا لے کر سیلاب میں چھلانگ لگا دوں اور سیدھا دریائے راوی میں پہنچ جاؤں

واپس ہوئے تو بائیں کنارے والے پانی میں ڈوبے ہوئے کچے مکانوں کی طرف سے آواز آئی۔ ''پانی اور آ گیا ہے بانو۔ صندوق اوپر لے آ۔''

بگلوں کی ایک قطار ہمارے سروں کے اوپر چیختی ہوئی گزر گئی۔ سامنے ذرا فاصلے پر لاہور سٹیشن سے چلنے والی گاڑی کا سگنل ڈاون ہو چکا تھا۔ سیلاب کا سگنل بھی ڈاون ہو چکا تھا حالانکہ ابھی اساڑھ کی 28 تاریخ تھی۔ ابھی سیلاب کا موسم بہت دور تھا۔ ابھی ساون بھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوا تھا۔ مگر بارشوں نے پیچھے جنگلوں میں تباہی مچا دی تھی۔ گہرے تاریک' سنسان' گنجان پراسرار جنگلوں میں رات رات بھر بارشیں ہوتی تھیں۔ اور دریاؤں میں سیلاب آ رہے تھے۔ وہ اپنے کناروں سے اچھل کر تیز رفتار سیلابی لہروں پر سوار شہر اور دیہات کے مکانوں کو اپنے گھیرے میں لے رہے تھے۔

''یہ تو خدائی قہر ہے۔ قہر خدا بے شک جی۔'' دو دیہاتی باتیں کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ واپسی پر ہمیں پھر اسی ''پل صراط'' پر سے گزرنا پڑا۔ اب ہم نے اپنی بہادری کی کینچلی اتار دی تھی اور عام زندگی سے پیار کرنے والے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے انسانوں کی طرح طوفانی نالے کی ایک اینٹ والی دیوار سے گزر رہے تھے۔ پانی کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز معلوم ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر چکر آ گیا۔ ذرا پھسلے تو دھڑام سے شاہدرے کا سیلابی نالہ اور پھر راوی پھر سندھ پھر سمندر اور پھر انا للہ و انا علیہ راجعون۔

سڑک پر آ کر سجدہ شکر ادا کیا۔ سیلاب کا پانی سڑک پر لہریں لے رہا تھا۔ پانی ہمارے جوتوں میں بھی گھس آیا۔ یہ ٹھنڈا اور دل و دماغ کو سکون پہنچانے والا پانی لیکن اسی پانی نے ہزاروں لوگوں کے دل و دماغ کا سکون چھین لیا تھا۔ یہی پانی جب دریا کی حدود میں رہتا ہے۔ تو زمین سے سنہرے شگوفوں کو جنم دیتا ہے اور جب سیلاب کا روپ دھار کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے تو درختوں کو جڑوں سے اکھیڑ ڈالتا ہے۔ مکانوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔

محمود بوٹی بند کی طرف جاتے ہوئے میں نے دائیں جانب ایک جھتناری بڑ کے درخت تلے چھوٹا سا کچا مکان دیکھا۔ جس کے صحن میں پانی پھر رہا تھا اور ایک میلی سی سانولی سی لڑکی چارپائی کے سہارے دیوار پر کہنیاں ٹیکے کھڑی تھی۔ اور بڑی اداس نظروں سے سیلاب کے پانی کو تک رہی تھی۔ اس کے کانوں کی سنہری ڈنڈیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

بند کے ساتھ ساتھ پرلی طرف سیلاب پورے جوش پر تھا۔ کھوکھر گاؤں پوری طرح زیر آب چکا تھا اور لوگ کشتیوں میں آ جا رہے تھے۔ گاؤں والوں نے اپنے مکان نہیں چھوڑے تھے۔ مکانوں سے نکل کر وہ آخر جائیں بھی کہاں۔ ذخیرے کی جانب ہمیں ایک کشتی نظر آئی جو وہیں پر درختوں کی گہری گہری چھاؤں میں چکر کھا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ پانی میں چل پھر کر کدو ڈھونڈ رہے ہیں۔

”جی ہاں کچھ اپنے اور زیادہ دوسروں کے۔“ ایک دیہاتی نے ہمیں لقمہ دیا۔

واپسی پر جب ہم راوی برج عبور کر کے راوی روڈ پر آئے تو ہمیں خوبصورت ریشمی کپڑوں والی عورتوں اور نوجوانوں مردوں سے بھری ہوئی ایک کار ملی جس کی چھت پر آموں کے ٹوکرے لدے ہوئے تھے۔ لڑکیاں آم بھی چوس رہی تھیں اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ بھی ہوئی جا رہی تھیں۔ کار کا ریڈیو آن تھا اور فلمی گیت کی لہریں فضا میں بکھر رہی تھیں۔

ایک پردیسی میرا دل لے گیا
موٹی موٹی اکھیوں میں آنسو دے گیا

◆◆◆

چالو سکہ

ڈی۔ایچ لارنس اور آسکر وائلڈ کے نام اکثر سنے تھے۔لہذا فلمی دنیا میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شیلے کی نظموں اور لارنس کے افسانوں کے دو پنگوئن ایڈیشن خرید کر بڑے لاابالی انداز میں دبائے اور ہر فلمی محفل میں بات بات پر ان یورپی مصنفوں کے حوالے دینے شروع کر دیے۔لیکن کبھی کبھی میں غلط حوالے بھی دے جاتا مثلاً ابھی پرسوں کا ذکر ہے کہ ایک پروڈیوسر سے گفتگو کر رہا تھا۔بات فلموں کے خام مواد کی ہو رہی تھی۔میں نے حسب عادت آؤ دیکھا نہ تاؤ۔جھٹ فقرہ جڑ دیا۔

اجی خام مواد کا مسئلہ ولایت میں بھی اسی لاینحل ہے۔سوئٹزرلینڈ کے مشہور شاعر ٹالسٹائی نے بھی اپنی ایک مشہور نظم میں اس موضوع پر کافی آنسو بہائے ہیں۔میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔جب گھر آن کر میں نے ایک اردو کے مضمون میں پڑھا کہ ٹالسٹائی تو انیسویں صدی میں روس کا ناول نویس اور افسانہ نگار تھا۔لیکن اس خیال سے دل کو تسلی ہوئی کہ جس محفل میں میں نے یہ غلط بات کی تھی وہاں کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔میں اگر یہ بھی کہہ دیتا کہ ٹالسٹائی نام کا ایک بوڑھا آج سے دس سال پہلے موچی دروازے کے باہر گنڈے بیچا کرتا تھا تو وہ بڑی خوشی سے یقین کر لیتے۔دوسری مشکل یہ پیش آئی ہے کہ انگریزی سے بلکہ انگریزی ادب سے نابلد ہونے کے باعث میرے منہ سے اکثر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کے غلط نام نکل جاتے ہیں۔یعنی میں شیلے کو ہمیشہ شیلی کہتا ہوں۔چیچوف کو چہ خوف' دوستوسکی کو اکثر دوستووسکی' یا ترن کو بیرن' ڈی ایچ لارنس کو ڈی ایچ لارنس اور گوگول کو گول گول کہہ جاتا ہوں جس پر نہ تو مجھے کوئی ندامت محسوس ہوتی ہے اور نہ میرے فلمی دوستوں کو حیرت ہوتی ہے۔مجھے اس لئے ندامت نہیں ہوتی کہ میں جاہل اور ڈھیٹ ہوں۔فلمی دوستوں کو اس لئے حیرت نہیں ہوتی کہ وہ ان پڑھ ہیں۔لیکن وہ مجھ سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ میں فلمی دنیا میں واحد آدمی ہوں جس کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور جس کا علم یورپ کے تمام ادب پر محیط ہے۔ویسے اردو ادب پر بھی اس خاکسار کو بڑا عبور حاصل ہے۔یہ دریا میں نے ''مردہ تاری'' لگا کر عبور کیا ہے اس بحر ذخار میں جال پھینک کر خاکسار نے نادر پلاٹ دلچسپ کردار اور پروڈیوسروں کو بھڑکا دینے والے مکالموں کی رنگ برنگی مچھلیاں پکڑی ہیں۔مثلاً مجھے معلوم ہے کہ اگر ماں اور بیٹی کا رقت آمیز منظر ہو تو وہاں راشد الخیری کے مکالمے بڑے موزوں رہتے ہیں۔

باپ بیٹے کا سین ہو اور بیٹے کے سامنے قربانی دینے کا سوال ہو تو وہاں منشی پریم چند کا ناول بڑا کام دیتا ہے۔

ہیرو ہیروئن کا محبت بھرا منظر ہو تو مشہور ڈرامہ نویس کرشن چندر سے بڑھ کر کوئی مصنف وہاں کام نہیں آ سکتا۔

سرمایہ دار اور غریب کی ٹکر ہو رہی ہو تو علی سردار جعفری یا ساحر لدھیانوی کے کسی بھی شعر کو آپ مکالمے کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ حسن وعشق کی ٹکر کے نازک موقع پر اور اسی قسم کا کوئی دوسرا ادیب کام آ سکتا ہے۔

خاص لکھنوی انداز کا مزاحیہ سین ہو تو شوکت تھانوی کے افسانے کا کوئی بھی صفحہ اٹھا کر میں اسے استعمال کر سکتا ہوں۔

معرکہ اسلام کفر در پیش ہو تو نسیم حجازی کا جواب نہیں ہے۔

رنڈی اور اس کے ٹکرائے ہوئے عاشق کا معاملہ ہو تو ایم اسلم کے ناول کا انبار لگا رکھئے۔ اور علیٰ ہذا القیاس!

تمام فلمی رسالوں کے ایڈیٹروں سے میں نے بڑے اچھے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ فلمی دنیا میں مجھے کافی کام ملتا ہے۔ میری جیب اکثر بھری رہتی ہے اور دماغ عام طور پر خالی رہتا ہے۔ چنانچہ میں ان ایڈیٹروں کو عموماً کھلاتا رہتا ہوں۔ میں نے انہیں ہدایت کر رکھی ہے کہ میری خبر جلی حروف میں لکھوائیں اور میرے نام کے ساتھ مشہور ادیب یا مایہ ناز مصنف یا ترقی پسند ناول نویس ضرور لکھیں۔ جو ایڈیٹر ذرا خوددار ہیں اور دام ہوس میں نہیں پھنستے ان کے لئے میں چند ایک کرایہ کے غنڈے ہر وقت تیار رکھتا ہوں جو نہیں میرے ایک ہلکے سے اشارے پر اٹھا کر دریائے راوی میں پھینک سکتے ہیں۔

میں نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ اگر کوئی عزت نہ کرے تو اس کو بے عزتی کر دو اور بھری محفل میں اس کی پگڑی اچھال دو۔ بس وہ ساری عمر آپ کا رہے گا۔ اپنی شرافت کی وجہ سے وہ آپ سے ڈرتا رہے گا اور آپ بڑے دبنگ قسم کے آدمی مشہور ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ خاکسار بسا اوقات فلمی پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں میں یہی حربہ استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اکثر لوگوں سے سنیں گے کہ بس بڑا منہ پھٹ ہوں اور کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بڑا بزدل آدمی ہوں اور چوہے سے بھی ڈر جاتا ہوں۔ ایک بار اسی رواں روی میں میں نے ایک مشہور ایکٹر کی سب کے سامنے بے عزتی کر دی تو اس نے مجھے بڑی محبت سے الگ لے جا کر ایک ایسی پٹخنی دی کہ میرے گھٹنے کی ہڈی کٹک سے ٹوٹ گئی۔ فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑا کر معافی مانگی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ سوائے میرے چند ایک جگری دوستوں کے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

میں نے اپنا ایک فلمی اصول بنا رکھا ہے کہ جب مکالمے لکھنے بیٹھتا ہوں تو اندر کسی کو نہیں آنے دیتا۔ پروڈیوسروں کو میرا یہ آرڈر ہوتا ہے کہ میرے کمرے میں چڑیا بھی پر نہ مارے۔ پروڈیوسر بیچارا کمرے کے باہر آرام سے کرسی پر بیٹھا پہرہ دیتا رہتا ہے۔ وہ

کسی کو اندر نہیں جانے دیتا۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ میں کمرے میں بیٹھا ماہنامہ فردوس لکھ رہا ہو • حالانکہ میں اندر بیٹھا یا تو کوٹ کی اندرونی جیب سے کاغذ نکال کر سین کے مطابق کسی مشہور مصنف کی کتاب سے لئے ہوئے مکالمے نقل کرتا رہتا ہوں یا دیا سلائی سے کان کا میل نکالتا رہتا ہوں۔ لیکن میرے دم خم کوئی اس وقت دیکھے جب سین سنا رہا ہوں کبھی یوں لگتا ہے کہ جنگل میں شیر دھاڑ رہا ہے کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شیش محل میں کتا داخل ہو کر پاگل ہو گیا ہے۔ کبھی چوہے کی طرح دبک جاتا ہے کبھی گیڈر کی طرح اداس ہو جاتا ہوں کبھی ہاتھ ہلاتا ہوں۔ کبھی گردن کی رگیں پھلاتا ہوں کبھی دیوار سے ٹکر مارتا ہوں۔ کبھی پروڈیوسروں کی قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ کبھی فنانسر کے پاؤں سے لپٹ جاتا ہوں۔ غرض کہ پورا ڈرامہ تخلیق کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں دردمند باپ کو اپنی غلطی پر پچھتانے والے ہونہار بیٹے کے مکالمے سنا رہا تھا۔ میں نے تصور ہی تصور میں پروڈیوسر کو باپ سمجھ لیا اور مکالمے سناتا سناتا جذبات کے جوش میں اٹھا اور لپک کر پروڈیوسر کے قدموں میں دھڑام سے گر پڑا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ پروڈیوسر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور میرے ہاتھ میں پانچ سو روپے کا چیک تھا۔!

◆◆◆

پردہ گرتا ہے

آپ کا اسم شریف؟

مس لذت پذیر چکودروی۔

سبحان اللہ! کتنا پیارا نام ہے۔

زبان پر بار خدایا یہ کس کا نام آیا۔

کہ میرے نطق نے گھونسے میری زبان کو دیئے۔

اور باپ کا اسم شریف۔

غلام شریف۔

آپ کی عمر شریف۔

پندرہ برس۔

معاف کیجئے گا۔ آپ کا سینہ دیکھ کر تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک درجن بچوں کو دودھ پلا چکی ہیں۔

بکواس نہ کرو۔ میں تو ابھی کنواری ہوں۔

معافی چاہتا ہوں ہاں تو آپ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ اچھا یہ بتایئے۔ آپ کی پہلی فلم کونسی تھی؟

میری پہلی فلم کا نام شگوفہ جادوگرنی عرف کوروکشیتر کا سوداگر تھا۔ اس فلم میں میں نے شگوفہ جادوگرنی کا پارٹ ادا کیا تھا۔ یہ فلم خاموش تھی اور اور میں نے اس میں سات عدد گانے گائے تھے۔ یہ فلم بڑی کامیاب ہوئی اور سینما ہال میں صرف سات عدد کرسیاں توڑی گئیں۔

ماشاللہ۔ اب تو آپ نے کافی ترقی کر لی ہوگی۔ مس لذت پذیر صاحبہ جی ہاں اب میری فلم کے ہر شو میں زیادہ سے زیادہ کرسیاں توڑی جاتی ہیں اور بیشتر سینما ہالوں میں تماشبین چٹائیوں پر لیٹ کر فلم دیکھتے ہیں۔ یہ تو بتایئے کہ لوگ آپ کی کس ادا پر

کرسیاں توڑنا شروع کرتے ہیں۔اصل میں بات یہ ہے کہ لوگ زیادہ تر میری چھوٹی چھوٹی مونچھوں اور تھوڑی تھوڑی بھینگی آنکھوں پر فدا ہیں۔اس کے علاوہ جب کبھی میں اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا کر اپنے بھاری بھرکم سینے کو بلکہ آپ سے کیا پردہ سینے کے اندر ٹھونسے ہوئے ریشمی رومالوں کو جنبش دیتی ہوں تو لوگ چیخنا شروع کر دیتے ہیں اور جب میں اس کے ساتھ ہی ریچھ کی طرح کولہے مٹکا مٹکا کر دھک دھما دھم ناچنا شروع کرتی ہوں تو لوگ پہلے تو اپنا سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں مگر جب جوش جنون کم نہیں ہوتا تو بے اختیار اٹھتے ہیں اور کرسیاں توڑنا شروع کر دیتے ہیں۔مجھے گاتا دیکھ کر تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔جب میں نتھنے اور گلے کی رگیں پھلا کر گانا شروع کرتی ہوں تو ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور پھر وہ بھگدڑ مچتی ہے کہ گری پڑی چیز بھائی نہیں دیتی واہ واہ کیا گلا پایا ہے کیا ستم اندوز آہیں ہیں۔

اچھا مس لذت پذیر! یہ بتایئے کہ آپ کی ہابیز کیا کیا ہیں؟ وہ کیا ہوتا ہے؟

لاحول ولا! مس لذت پذیر۔آپ اتنی بڑی ایکٹرس ہیں اور آپ کا ہابیز کا نہیں پتہ۔ہابیز تو بڑی ضروری چیز ہے اس کے بغیر آپ کبھی مشہور و معروف نہیں ہو سکتیں۔

لیکن آخر یہ ہے کیا بلا؟

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو کس چیز کا شوق ہے؟

یہ کونسی بڑی بات ہے؟ مجھے عشق کرنے روپیہ کمانے اور اپنے باپ کی توند موٹی کرنے کا شوق ہے۔

سبحان اللہ کیا آپ کے باپ کی توند پہلے ہی سے موٹی نہیں تھی۔

جی نہیں پہلے تو تھی ہی نہیں۔یہ تو میری مشہوری کے ساتھ ہی ابھرنا شروع ہوئی ہے۔جوں جوں میں مشہور ہو رہی ہوں۔میرے کنٹریکٹ ہو رہے ہیں۔ابا جان کو توند آپے سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔

اپنی توند کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے مس لذت پذیر؟

بکواس بند کرو۔میں تو ابھی کنواری ہوں۔ابھی میری عمر ہی کیا ہے کہ اس علاوہ مجھے چرس پینے اور مالش کروانے کا بہت شوق ہے۔

خدا کے لئے ایسا نہ کہیے۔یہ تو آپ کی پرائیویٹ ہابیز ہیں۔یہ تو سب کی ہوتی ہیں۔فیشن ایبل ہابیز لکھوایئے فیشن ایبل ہابیز مثلاً کو کلوں کی کوکو سے محبت کرنا ایرانی بلیاں پالنا۔صبح کو اٹھ کر نماز پڑھنا اور اسی پوز میں تصویریں اتروانا۔

جی ہاں۔تو پھر لکھیے۔

مجھے دبنے پالنے۔اور انہیں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔میں نے پہلا دنبہ اپنی فلم "ریشہ خطمی" کی نمائش کے دوسرے ہی دن اقبال پارک میں اپنے پروڈیوسر سے لڑایا تھا۔میرا دنبہ جیت گیا تھا اور مجھے انعام میں اگلی فلم کا کنٹریکٹ ملا تھا۔میں نے ایک اپنا دنبہ بھی پال رکھا ہے۔میرا خیال ہے آپ نے گانا بجانا اسی دنبے سے سیکھا ہوگا۔

جی ہاں بالکل میرا دنبہ رات کو فنا آلود راگ گاتا ہے۔اس کا گانا جانوروں پر بڑا اثر رکھتا ہے۔چنانچہ میں نے اسی کا گیت اپنے پروڈیوسر کو سنایا تو اس پر بڑا اثر ہوا اور اس نے فوراً مجھے اپنی فلم میں لے لیا۔

کیا بات ہے۔اچھا مس لذت گیر۔میرا مطلب ہے لذت پذیر۔یہ تو بتایئے کہ آپ فلم انڈسٹری میں کس کی خدمت کر رہی ہیں۔؟

جی صرف آرٹ کی خدمت کر رہی ہیں۔آرٹ سے مراد آپ کے والد صاحب تو نہیں۔؟

جی نہیں ہرگز نہیں میرے والد صاحب کو تو آرٹ سے دور کا بھی واسطہ نہیں بہت خوب تو آپ آرٹ کی خدمت کر رہی ہیں۔

جی ہاں میں اپنی اداکاری کے ذریعے ملک اور قوم کا اخلاق بلند کرنا چاہتی ہوں اور بعض رجعت پسند ہم وطنوں پر ثابت کر دینا چاہتی ہوں کہ شریف گھرانے کی لڑکیاں بھی فلمی دنیا میں آ کر قومی اور ملکی خدمت سرانجام دے سکتی ہیں۔

زندہ باد زندہ باد! میرا خیال ہے۔آپ نے اپنا اخلاق اب تک کافی بلند کر لیا ہوگا۔

جی ہاں! جب پہلے پہل اخلاق میرے پاس آیا تو اس کا قد بھی چھوٹا تھا اور وہ گونگا اور بہرہ تھا۔میں نے برسوں کی محنت کے بعد اس کا قد لمبا کر دیا ہے اور اب وہ دیکھتا ہے۔سنتا ہے بولتا ہے۔کاٹنے کو دوڑتا ہے اور وسکی پی کر گھنٹوں صوفے پر مگن رہتا ہے۔

سبحان اللہ اخلاق ہو تو ایسا۔اچھا یہ بتایئے۔آپ کو کونسا ناچ پسند ہے؟

کتھا کلی یا بھارت نیٹم؟

تو یہ کیجئے یہ تو ہندوؤں بلکہ کافروں کا ڈانس ہے۔مجھے تو اپنا پاکستانی ڈانس ہی اچھا لگتا ہے۔اس ڈانس کا نام پاک نیٹم ہے۔یہ ایسے ہی ناچا جاتا ہے۔جیسے مزدور مٹی میں گھائی کرتے ہوئے ٹانگیں چلاتے ہیں۔اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ ناظرین کی زیادہ سے گوڈی کی جائے۔پہلے ان کے رونگٹے کھڑے کئے جائیں اور پھر الٹے استرے سے حجامت کر دی جائے۔

ماشاءاللہ آپ کو تو اس ناچ میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی ہو گی کیوں نہیں۔؟ کئی برس سے حجامت نیٹم۔میرا مطلب ہے پاک

میٹم ناچ رہی ہوں۔

آپ کے دانت اتنے خوبصورت کیوں ہیں؟ خدا کی قسم وہ بتیسی پائی ہے کہ پریم پچیسی کو مات کردیا ہے۔

دراصل آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے منہ میں چونسٹھ دانت ہیں بتیس نقلی اور بتیس اصلی۔ اصلی دانتوں سے کھانا کھاتی ہوں اور نقلی دانت لوگوں کو دکھاتی ہوں۔

''اچھا آپ ناشتے پر کیا کھاتی ہیں؟''

دو عدد مسواکیں اور بیل کا مغز۔

کیا خوب۔۔۔۔۔۔۔جبھی آپ بہت ذہین ہیں۔

دراصل مجھے یہ عادت ڈائریکٹر نے ڈالی ہے بیل کا مغز ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ انہوں نے ملک کے ہزاروں بیلوں کے دماغ نوش جان کر ڈالے ہیں اور اب انہوں نے ناظرین کے دماغ کھانے شروع کردیئے ہیں۔

اچھا مس چکوڑروی صاحبہ آپ نے کبھی کسی سے محبت بھی کی ہے؟

کیوں نہیں؟ محبت کرنا تو کوئی مجھ سے سیکھے۔ سب سے پہلے میں نے ابا جان سے محبت کی' پھر خداداد بینڈ ماسٹر نے مجھے اپنے دام تزویر میں پھنسایا۔ وہاں سے نکلی تو ایک کوچوان نے محبت کا سانٹا مارا۔ اس کے تانگے سے چھلانگ لگائی تو معراج دین کبابیئے کے بیٹے نے سیخ عشق پر چڑھایا۔ وہاں جب ایک پہلو جل اٹھا تو دوسرا پہلو بدل کر ماسٹر علم دین ٹیلر کی گرم گرم استری پر آن گری۔ عشق نے ٹیلر ماسٹر کا گریبان چاک کر ڈالا۔ ایک روز وہ بھی بھاگ اٹھا۔ یہاں ایک ڈائریکٹر صاحب سے آنکھ لڑ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ میں ملک کی مایہ ناز ایکٹرس بن سکتی ہوں۔ چنانچہ مجھے اپنے رہڑے پر بٹھلا کر اپنے سٹوڈیو لے آئے۔

آج کل آپ کس سے محبت کر رہی ہیں؟

کس کس سے کہئے۔ میری محبت کے بٹیر ایک آدمی کے قابو میں نہیں آسکتے ہیں۔ جوان ہوں حسین ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدن ہوں۔

سبحان اللہ اب آخر میں یہ بتایئے کہ آپ لباس کونسا پسند کرتی ہیں؟

ایسا لباس جو کپڑے کے بغیر تیار ہوتا ہے اور جسے پہن کر کپڑا کہیں دکھائی نہیں دیتا مگر جسم جگہ جگہ سے دکھائی دیتا ہے۔

آہ مس لذت پذیر۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اندھا ہو گیا۔ میری آنکھیں۔۔۔۔۔۔میری آنکھیں۔

آرزو لکھنوی لاہور میں

(عظیم شاعر کی روح سے معذرت کے ساتھ)

انتہائی غیر ثقہ راوی کا بیان ہے کہ حضرت آرزو لکھنوی جب کلکتہ سے کراچی تشریف لائے تو ان اصحاب نے جنہیں آرزو صاحب کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل تھا انہیں مشورہ دیا کہ پاکستان کی فلمی صنعت سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے ملک کی انڈسٹری کی ترقی میں مددگار ثابت ہوں۔ آرزو صاحب پرانے زمانے کے بڑے وضعدار بزرگ شاعر تھے۔ انہوں نے اب تک جن فلم کمپنیوں میں کام کیا تھا۔ وہاں بڑا گھریلو ماحول ہوا کرتا تھا اور انہیں بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر آدمی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہاں کی فلم انڈسٹری میں شاعر یا گیت لکھنے والے کا جو مقام تھا اس کا تھوڑا بہت حال ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دوستوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بھائی میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ فلم کے لائق نہیں رہا۔ اب تو یہ کام نوجوان شعراء کو سنبھالنا چاہیے لیکن کراچی جیسا شہر اور آرزو جیسا آدمی۔ آدمی کے ذرائع محدود ہو جانے سے اخراجات کا پلڑا نیچے جھکتا چلا گیا اور جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی۔ دیکھتے دیکھتے خرچ ہو گئی۔ لیکن خوددار طبیعت پائی تھی۔ دوستوں کے آگے دست طلب دراز کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ فلم انڈسٹری میں کام تلاش کیا جائے۔ مگر فلمی صنعت ابھی گھٹنوں کے بل رینگ رہی تھی۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے کراچی سے تیز گام میں بیٹھ کر شہر لاہور کی راہ لی۔

لاہور میں وارد ہو کر انہوں نے میکلوڈ روڈ کے ایک درمیانے ہوٹل میں اقامت اختیار کی اور کام کی تلاش شروع کر دی۔ اب یہ بات تو آرزو صاحب کی شان کے خلاف تھی کہ وہ دن بھر دفتروں کا طواف کرتے اور اسٹوڈیوز کی خاک چھانتے پھرتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مشہور شاعر ہیں۔ ہندو پاک ایک زمانے میں ان کے فلمی گیتوں کی تانوں سے گونجتا رہا ہے۔ لوگ خود کام لے کر ان کے پاس آئیں گے۔ چنانچہ وہ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھتے اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر فلم پروڈیوسروں کا انتظار شروع کر دیتے۔ کمرے میں ان کا بڑا مختصر سا سامان تھا۔ کرسیاں میز ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے لئے ایک چھوٹی سی چٹائی بچھا رکھی تھی جس پر وہ گاؤ تکیے کے سہارے دیوار سے ٹیک لگائے پان کی ننھی سی گلوری کلے میں دبائے اطمینان سے بیٹھے مطالعہ یا فکر سخن میں

مشغول رہتے۔ان کے عقیدت مند ٹولیوں کی صورت میں ان سے ملنے آتے۔ چٹائی کے اردگرد زانو بیٹھ کر اظہار عقیدت کے پھول پیش کرتے اور آرزو صاحب کی چائے پیسٹری اور سگریٹ پھونک کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر رخصت ہو جاتے۔ اپنی طویل و بے معنی نظمیں اور غزلیں سنانے کے لئے آرزو صاحب سے ان کے اشعار سنتے مستوں کی طرح ہر شعر پر سر ہلاتے جو شعر بالکل سمجھ میں نہ آتا اس پر واہ واہ کے نعرے لگاتے۔ اپنا سر نوچ لیتے۔ فرط مسرت سے چیخ مار کر مزید چائے اور پیسٹری اور سگریٹ کا آرڈر دیتے اور خوب شکم سیر ہو کر پرنم آنکھوں سے اشکبار ہو جاتے۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ آرزو صاحب کے پاس ان کے پیٹو عقیدت مندوں کا تو تانتا بندھا رہا لیکن کام کی بات کرنے والا ایک آدمی بھی نہ آیا۔ ہر روز چائے وغیرہ کے لمبے لمبے بل ادا کرنے سے وضعدار نرم مزاج' منکر المزاج' فرشتہ سیرت آرزو صاحب کا دیوالہ نکل گیا۔

ایک روز مجبور ہو کر اپنے دفتر بیٹھنے والے ایک با اثر آدمی سے باتوں ہی باتوں میں ذکر کیا گیا کہ اگر کسی فلم کا ایک آدھ گیت لکھنے کو مل جائے تو بہتر ہوگا، بیکار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں۔ اس آدمی نے آرزو کے اس خیال کی بہت تعریف کی اور فوراً ایک پروڈیوسر ڈائریکٹر سے بات طے کر دی۔ یہ پروڈیوسر ڈائریکٹر بڑا جاہل مگر فلم انڈسٹری کا بڑا کامیاب اور بد دماغ آدمی تھا۔ یہ آدمی پہلے پہل ایک تصوراتی ٹرانسپورٹ سروس کے دفتر میں ٹکٹیں بیچا کرتا تھا۔ وہاں اس نے اپنی ریشہ دوانیوں سے کمپنی کے ایک ایسے حصہ دار کو پھانسا جس کی دو لاریاں اور تین ٹرک چلتے تھے۔ فلم کمپنی کے سبز باغ اور کچھ سبز پریاں دکھلا کر اس چالاک آدمی نے عیش پسند حصہ دار کے دو ٹرک جھٹ سے بکوا کر اپنی ایک فلم کمپنی کھڑی کر لی اور دفتر کے باہر شیورلٹ فلم کمپنی کا بورڈ لگا دیا۔ پہلی فلم کا نام ڈرائیور کا عشق عرف بھولا شکار رکھا۔ جس میں بھولے شکار کا پارٹ ٹرک کے مالک نے ادا کیا۔ اگرچہ عیش پسند حصہ دار کے فلم کی تکمیل تک باقی ٹرک اور لاریاں بھی اونے پونے بک گئیں۔ لیکن فلم نے بڑا کامیاب بزنس کیا۔ آخر پروڈیوسر مسٹر گل گھوٹو کا ستارہ چمک اٹھا۔ بیک وقت دو فلموں کا اعلان کر دیا۔ اور ان کی کاغذی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلی فلم کا نام ''ریا کار حسینہ'' اور دوسری کا نام ''ہوس کا غلام'' رکھا۔ آرزو صاحب کو ہوس کا غلام فلم کے گیت لکھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ قدرتی طور پر مسٹر گل گھوٹو آرزو صاحب کے شعری اور شخصی منصب سے نا آشنا تھا۔ چنانچہ اس نے بجائے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے انہیں بہ نفس نفیس اپنے دفتر میں بلایا۔

جس وقت آرزو صاحب ''شیورلٹ فلم کمپنی'' کے دفتر میں داخل ہوئے اس وقت گل گھوٹو اپنے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے سر کی مالش کروا رہے تھے۔ آرزو صاحب آداب عرض کہنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گئے۔

''جی مجھے آرزو لکھنوی کہتے ہیں۔''

گل گھوٹو کا خیال تھا کہ اس کے واقف کار نے جس نے آرزو لکھنوی نام کے شاعر کا ذکر کیا تھا۔ وہ کوئی نوجوان قسم کا لمبے لمبے بالوں والا شاعر ہوگا' جس کے ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ڈبہ ہوگا' جس پر بوسکی کا کھلا کرتہ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی اور ہونٹوں پر ''جی حضور'' ارشاد کا ورد ہوگا۔ مگر یہاں پر تو اس کے سامنے ستر' پچہتر برس کا ایک مختصر سا مریل بوڑھا سر پر سرخ ترکی ٹوپی رکھے گاڑھے رنگ کی شیروانی اور کھدر کا کرتہ پہنے بیٹھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے واقف کار کو دو تین موٹی گالیاں دیں اور سوچنے لگا کہ یہ بوڑھا کیا خاک فلم کے چلتے گیت لکھے گا۔ لیکن چونکہ اس سے آرزو لکھنو کے فلمی گیتوں کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ اس لئے بڑی گرم جوشی سے اٹھ کر آرزو صاحب سے ہاتھ ملایا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اپنی زیر تکمیل فلم ''ہوس کا غلام'' کی دو ایک سچویشن بتانے لگا۔

''آرزو صاحب پہلی سچویشن ہے کہ فلم کا ہیرو اپنے ماں باپ کے سر میں خاک ڈال کر ناگ پھلی طوائف کی زلف کا اسیر ہو گیا ہے۔ وہ دن رات رنڈی کے کوٹھے پر عیش وعشرت میں محو رہتا ہے اور ساری دنیا سے بے خبر ہے' اسے وہیں خبر ملتی ہے کہ اس کی ماں ایک ٹرک کے نیچے آ کر مر گئی ہے۔ ہیرو رنڈی سے گانا سن رہا ہوتا ہے یہ خبر سنتے ہی شراب کا جام لہرا کر کہتا ہے۔ مائیں سب کی مر جاتی ہیں۔ کوئی ٹرک تلے آ کر جان دیتی ہے تو کوئی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہے۔ گاؤ خوب گاؤ آج میرے غم کو ساری دنیا کے غم کو شراب کے جام میں انڈیل دو ہاہاہا لیکن رات کو اس کا ضمیر اس کے سامنے آئینے میں آ کر اسے ملامت کرتا ہے۔ اس وقت گلی میں ایک فقیر گاتا ہوا گزرتا ہے۔ بس اس کا گیت ایسا ہو جو پورے منظر پر فٹ آئے۔''

دوسرے روز آرزو صاحب اس سچوایشن پر جو گیت لکھ کر لے آئے اسے انہوں نے خود تحت اللفظ پڑھ کر سنایا۔ اس روز گل گھوٹو کے دفتر میں اس کا اپنا فلمی شاعر بھی موجود تھا۔ آرزو صاحب کا گیت یہ تھا۔

تیرے دیئے میں کتنا تیل

دیکھ تو کتنی رات گئی

دہری جتی دھک دھک کرتی

سانجھ کو بھور بنائے

تجی بھور سے پہلے پہلے

دیوانہ گل ہو جائے
دیکھو تو کتنی رات گئی
پھول کا جوبن چاند کا ساتھی
رات بسے کا روپ
جاتی چھاؤں ہے سماں سہانا
پھر وہی دھوپ کی دھوپ
دیکھو تو کتنی رات گئی

گیت کا سننا تھا کہ پوری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ گل گھوٹو کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کسی نے اسے زبردستی زمین پر لٹا کر موبل آئل پلا دیا ہو۔ وہ بار بار گلا صاف کرنے کھنکارنے اور تھوکنے لگے۔ بوسکی کے کھلے کرتے' گولڈ فلیک کے ڈبے اور سلیم شاہی جوتی والا فلمی شاعر میوزک ڈائریکٹر کی طرف منہ کر کے تضحیک کے انداز میں ہنسنے لگا۔ آرزو صاحب ان باتوں سے بے نیاز اپنی عینک اتار کر بچوں ایسی دلچسپی کے ساتھ اس کے شیشے صاف کر رہے تھے۔ آخر گل گھوٹو نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"آرزو صاحب آپ کا گیت بہت اچھا ہے۔ اگر اس میں ہندی کے لفظ بڑے ہیں مثلاً بھور کیا اس کی جگہ نور کا تڑکا نہیں لکھا جا سکتا؟ ویسے گیت سچویشن پر فٹ نہیں آتا۔ یہاں تو کچھ اس قسم کا گیت چاہیے تھا جیسے .... جیسے ہمارے مشہور فلمی شاعر حضرت لمترنگ نے ایک مکھڑا لکھا ہے کیا ہے جی وہ؟"

لم ترنگ نے فوراً گولڈ فلیک کے ڈبے کو بائیں ہاتھ میں لیا اور دائیں ہاتھ سے اس پر طبلہ بجاتے ہوئے اپنا مکھڑا گانا شروع کر دیا۔

اللہ کے بندے جاگ ذرا
تو کیوں سویا ناداں
اٹھ اپنے رب کو پہچان
اللہ کے بند جاگ ذرا

اب آرزو صاحب کے سنانے میں آنے کی باری تھی۔ گل گھوٹو نے مسرت سے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''یہ بات ہے بس ایسا گیت چلے گا آرزو صاحب آپ ایسا کیجئے دوسری سچویشن لے جایئے اس پر طبع آزمائی کیجئے۔ دوسری سچویشن یہ ہے کہ ہیروئن عشق میں ناکام ہو کر آدھ سیر دہی کی لسی پینے کے بعد اپنے بیمار باپ کو سلا کر دوسرے کمرے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر دردناک گیت گا رہی ہے۔اس کا ہیرو اسے چھوڑ کر طوائف سے مل کر بیٹھا ہے اتنا یاد رہے۔''

دوسرے روز آرزو صاحب محنت اور رات بھر کی عرق ریزی کے بعد یہ لکھ کر لائے۔

نہ کوئی پریم کا روگ لگائے

پریمی کے اس پگلے پن پر

سب دینا مسکائے

روپ کے چتر کو من میں رکھ کر

آگ سے آگ بجھائے

گلی گلی پریم کو ڈھونڈے

جگ سے آنکھ بچائے

من میں روئے جی بھر بھر کے

اکھین میں مسکائے

نہ کوئی پریم کا روگ

پروڈیوسر ڈائریکٹر گل گھوٹو کی تو گھگھی بندھ گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔اسے فلمی گیت سنائے جا رہے ہیں یا بھگت کبیر کے دوہے۔وہ سر پکڑ کر بیٹھ رہا۔فلمی شاعر لم ترنگ نے خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔

''حضور!اسی سچویشن پر اس خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے۔عرض کیا ہے۔''لم ترنگ نے سگریٹ کا ڈبہ بجاتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔

نیلی چھت والا میرا دل لے گیا

رومی ٹوپی والا میرا دل لے گیا

کچھ اور مکھڑے ملاحظہ ہوں۔

دل لینے والے جلمی ہرجانہ دے جا
او جانے والے بابو ایک آنہ دے جا

میرا آیا ہے شباب او صنم او بلم
جیسے مچھلی کا کباب او صنم او بلم
جیسے آنکھوں کی شراب
جیسے بجتا ہو رباب ہائے صنم اوئی بلم

اور حضور ایک کلاسیکی مکھڑا ملاحظہ ہو:

میں البیلی رنگ رنگیلی
امیدوں کی اڑن کھٹولی
میری جوانی مست پہیلی
میں دل والوں کی رکھیلی
چھم چھما چھم ناچ چنبیلی
ناچ چنبیلی ناچ چنبیلی ناچ
چھن چھنا چھن چھنا چھن

آرزو صاحب حیرت واستعجاب کی مکمل تصویر بنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے آج تک ایسے فلمی گیت نہیں سنے تھے۔ گل گھوٹو بوسکی پوش فلمی شاعر کے سر پر واہ واہ کے ڈونگرے برسا رہا تھا۔ اپنی کامیابی پر شاعر کی باچھیں گدے کے جبڑوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ فرط مسرت سے سگریٹ ان کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا اور ریشمی قمیض کے نیچے بالوں بھرے سینے کے اندر کمزور بے نور اور بیمار دل دھک دھک دھڑک دھڑک کر شاعر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر رہا تھا۔

"آرزو صاحب! وہ زمانے گزر گئے جب لوگ پریم کا روگ لگایا کرتے تھے۔ اب تو پہلے بس سٹاپ پر عشق ہوتا ہے اور دوسرے بس سٹاپ پر اس کا سودا چکا دیا جاتا ہے۔ یہ تیل اور دیے کی بتی دیکھنے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل سو کینڈل پاور کی تیز

روشنیوں میں اچھلتی کودتی نیم عریاں رانوں سے جی بہلایا جاتا ہے۔گلی گلی پیتم کو ڈھونڈنے والے آج کل سینما ہال میں آ کر ایٹم جان کے فحش بھنگڑوں پر فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہیں۔اپنے گیتوں میں ہر طرح کی خرافات بھرنے کی کوشش کریں۔پھر دیکھئے آپ کے تن پر گاڑھے رنگ کی شیروانی کی بجائے بوسکی کا کھلا کرتہ ہوگا اور ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ڈبہ اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتی اور دماغ میں سبزی منڈی کا کچرا۔"

آرزو صاحب حیران و پریشان افتاں وخیزاں اپنے ہوٹل میں واپس آ گئے'انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر آج کل فلمی گیتوں کا معیار اس قدر گھٹیا اور لچر ہو گیا ہے تو وہ کسی فلم میں گیت نہیں لکھیں گے۔چنانچہ خاموشی سے اپنے ہوٹل کے کمرے میں جا کر بیٹھ رہے۔ادبی رسالوں میں ان کی غزلیں بہرحال شائع ہوتی رہیں۔مگر ان کا معاوضہ اتنا قلیل ملتا کہ چائے وغیرہ کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا۔دوسری طرف عقیدت مندوں کی ٹولیاں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔اپنی غزلیں سناتیں۔آرزو صاحب کی چائے پیسٹری اور سگریٹ پان اڑاتیں اور فرط محبت سے ان کا ہاتھ چوم کر رخصت ہو جاتیں۔نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آرزو صاحب کے پاس پیسے ختم ہو گئے۔پھر کسی عقیدت مند کی کاوش سے ایک پروڈیوسر ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ڈائریکٹر نے فوراً نئی فلم "بم بھوت میں" کے لئے آرزو صاحب سے معاہدہ کرلیا۔ایڈوانس وصول کرتے ہی انہوں نے ہوٹل کے سارے بقایا بل چکائے اور ڈائریکٹر کی عقل کے مطابق گیت لکھنے بیٹھ گئے۔دوسرے دن ڈائریکٹر صاحب تشریف لائے تو حضرت آرزو نے ہیروئن کی جدائی میں ہیرو کا میل سانگ کا مکھڑا سنایا۔

پریت میں ہے جیون جوکھوں

جوں کولہو میں سرسوں

ڈائریکٹر کو تو جیسے بھیڑیئے نے کاٹ کھایا۔مکھڑا دوبارہ سہ بارسنا اور کھوپری پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"معاف کیجئے گا آرزو صاحب۔ہمارا ہیرو کوئی تیلی نہیں ہے وہ تو جج کا بیٹا ہے پھر کولہو اور سرسوں کہاں سے آ گیا؟"

آرزو صاحب کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر ہوٹل کے ان گنت بل آ گئے۔ڈائریکٹر صاحب آج ایک فلمی شاعر مسمی بے عقل چوکتا کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔جس نے ریشمی کرتے کے کاجوں میں بٹنوں کی بجائے موتیے کے پھول لگا رکھے تھے۔ڈائریکٹر کا اشارہ پاتے ہی انہوں نے جھٹ اپنا گیت سنا دیا۔

تو ہے تنہائی ہے

میں ہوں انگڑائی ہے

الفت کی اک کہانی ہے

سپنوں کی رضائی ہے

دل لگا کے کیا سکھ پایا

او شوالے

او ہوا و ہوا و ہو

ڈائریکٹر خوشی سے اچھل پڑا۔

''یہ گیت یہ ہے ہٹ سانگ کہاں کولہو میں سرسوں اور کہاں الفت کی انگڑائی اور سپنوں کی رضائی واہ واہ! جیو میرے بے عقل چڑ کٹے جیو۔''

اگلے روز آرزو صاحب تیز گام کے تھرڈ کلاس میں بوریا بستر سمیٹے بیٹھے تھے اور گاڑی کراچی کی طرف اڑی جارہی تھی۔ انہوں نے دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ کراچی پہنچتے ہی وہ گولی مار کے علاقے میں پان سگریٹ کی دکان کے لئے کسی موزوں جگہ کی تلاش شروع کردیں گے۔

◆◆◆

عرس حضرت خواجہ بالے شاہ

(علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ)

پیر بالے شاہ کا مزار شاہی مسجد کی سیڑھیوں کی داہنی جانب حضوری باغ میں واقع ہے۔ یہ مزار بڑے پہنچے ہوئے بزرگ کا ہے۔ اس مزار پر سلامی دینے ملک کے کونے کونے سے درویش' صوفی' قلندر' فقیر' لولے' لنگڑے' اپاہج' اندھے' گنجے' کانے غرض کہ ہر قسم کے بزرگ پہنچتے ہیں اور جو نہیں پہنچ سکتے وہ یہیں ڈیرہ جما دیتے ہیں۔ مزار کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کی قطار انہیں پہنچے ہوئے فقیروں سے آباد ہے۔ حضرت بالے شاہ کا اصلی نام سر محمد اقبال ہے۔ جب تک زندہ رہے شعر کہتے رہے اور سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرتے رہے۔ جب وفات پائی تو سوئی ہوئی قوم بیدار ہو گئی۔ اور اس کے مزار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ قوالیاں ہونے لگیں۔ مزار کے جھروکوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ نذرانے گزارے جانے لگے۔ قلندروں نے گھنگرو باندھ کر اچھل اچھل کرنا چنا شروع کر دیا۔ سلفہ اڑنے لگا۔ بھنگ چھننے لگی۔ قوم جاگ اٹھی۔ ایک دم جاگ اٹھی اور اس نے اٹھ کر سب سے پہلا یہ کام کیا کہ مزار کے دروازے پر درگاہ ''حضرت بالے شاہ'' کی تختی لٹکا دی اور پیپل کے پیڑ پر ایک اونچا لمبا جھنڈا گاڑ دیا جس پر خواجہ کا یہ شعر رقم تھا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا ''جھنڈے'' سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ہر سال بڑی دھوم دھام سے خواجہ بالے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا عرس مبارک منایا جانے لگا۔ اس عرس پر دو ماہ پہلے ہی سے بالے شاہ کے بالکے سبز لباس پہنے' گلے اور پاؤں میں گھنگرو باندھے' بال کندھوں پر بکھیرے' ڈھول کی تال پر رقص کرتے ہوئے گلی گلی جا کر لوگوں سے چندہ مانگتے۔ چاول' آٹا' گھی اور تیل اکٹھا کرنا شروع کر دیتے۔ تھیٹریکل کمپنی والے جگہ کی عارضی الاٹمنٹ کے لئے کارپوریشن کو درخواستیں بھجوا دیتے۔ دکانوں میں سفیدیاں ہونے لگتیں۔ مزار کے سجادہ نشین صاحب مزار کے دروازوں پر روغن کراتے۔ قبر کے سرہانے جما ہوا تیل اور موم صاف کراتے۔ کونے کھدروں سے جالا اتروانے اور حجروں کا کرایہ تگنا کرنے کا آرڈر

ایشوع کر دیتے۔ شاہی محلے کی طوائفیں عرس میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے نئے نئے ڈیزائن کے لباس سلوانے لگتیں۔ غزلیں، فلمی طرزوں پر بٹھانے اور مومنوں کی زیادہ سے زیادہ حجامت کرنے کا کام شروع ہو جاتا۔ چنانچہ آج ہم آپ کو اسی عرس پر لئے جا رہے ہیں۔

پیارے قارئین! یہ عرس پورے سال بعد لگتا ہے اور یہاں دور دور کے فن کار حصہ لینے آتے ہیں۔ لہٰذا اپنی جیب پاکٹ سے خبردار رہ کر ہمارے ساتھ ساتھ چلیئے۔ اس لئے کہ یہاں ہر طرف مردِ مومن اور قلندر دکھائی دیتے ہیں اور بہت ممکن ہے آپ بڑے مخصوص وخشوع سے قوالی سن رہے ہوں اور کوئی مردِ مومن آپ کی جیب کی ساری خودی نکال کر لے جائے اور آپ کو خواجہ صاحب کا وہ مصرعہ یاد آ جائے کہ

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

آ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔ کیا نظر افروز اور ایمان افروز منظر ہے۔ کیا ''ذوق تماشا'' ہے کیا دیدہ بینا ہے۔ عرس پورے جوبن پر ہے آج عرس کی پہلی رات ہے۔ مزار کے در و بام چراغوں سے جھلملا رہے ہیں۔ اس قدر بھیڑ ہے کہ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ لہٰذا پیارے قارئین اپنے اپنے کھوے کندھوں سے اتار کر جیب میں رکھ لیں۔ ارے مزار کے اندر جانا تو لانا ہے جوئے شیر کا۔ اس قدر ہجوم مومنین! اس قدر شکوہ ملک و دیں! اللہ اللہ آج اگر خواجہ بالے شاہ زندہ ہوتے تو مرنے کے بعد اپنی اس قدر ہر دلعزیزی اور شہرت دیکھ کر فوراً خودکشی کر لیتے۔ قارئین دعائے مغفرت پھر پڑھ لیں گے۔ چلتے پہلے میلے میں گھوم پھر کر سیر کریں۔

ارے یہ قلعے کے دروازے کی طرف سے ڈھولی تاشوں کا شور کیا اٹھا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں جو نیم برہنہ ہیں اور ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے اٹھائے کمر کے گرد گھنگرو باندھے ناچتے چلے آ رہے ہیں؟ اوہو۔ یہ تو شیخو پورہ اور چوہا سیدن شاہ کے ننگے قلندروں کی ٹولی آئی ہے۔ یہ لوگ تو حضرت بالے شاہ کے خاص بالکے ہیں۔ انہوں نے تو حضرت صاحب کا کلام چاندی کے صندوق میں بند کر کے اپنے اپنے تکیوں میں رکھا ہوا ہے۔ صندوق پر کلمہ مبارک والی سبز چادر چڑھا دی ہے او صبح و شام اس کی پوجا ہوتی ہے۔ منتیں مانگی جاتی ہیں اور کسی ذی روح کو صندوق کے پاس تک نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ بھلا پیر بالے شاہ صاحب کے کلام کی زیارت کرنا معمولی بات ہے۔

ان لوگوں نے جو ڈنڈے ہاتھوں میں تھام رکھے ہیں انہیں یہ لوگ عصائے کلیمی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان سے یہ لوگ جانوروں کو ڈرانے اور بھنگ گھوٹنے کا کام لیتے ہیں اور کبھی کوئی قلندر ترنگ میں آ کر اسی ڈنڈے سے دوسرے کی کھوپڑی بھی اڑا

دیتا ہے۔خواجہ صاحب نے درست فرمایا تھا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

پیارے قارئین! کچھ اسی قسم کا شور دوسری جانب سے بھی اٹھ رہا ہے آہاہا ادھر سے بھی کچھ قلندر چلے آ رہے ہیں۔ان کی موٹی گردنیں سبز سبز منکوں والی مالاؤں سے لدی ہوئی ہیں۔انہوں نے بدن صرف لمبے سیاہ چغوں سے ڈھانپ رکھے ہیں۔ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں چمٹا ہے اور یہ لوگ صرف ایک ٹانگ پر ناچتے آ رہے ہیں۔یہ ٹولی بھی بالے شاہ کے گہرے عقیدت مندوں کی ہے۔وہ بھڑانہ ضلع شاہ پور سے آئی ہے۔کہا جاتا ہے کہ وظیفہ کرنے اور چرس پینے میں یہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔سبحان اللہ!

ہزار خوف ہو لیکن "چرس" ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

عرس شریف پورے جوبن پر ہے۔حضوری باغ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔روشنیاں ہو رہی ہیں۔لاؤڈ سپیکروں پر فلمی گانے شروع ہیں۔خوش بہار کا موسم ہے۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور مزار کو گھیرا ڈالے بیٹھی قلندروں کی ٹولی میں بھنگ کے جام چل رہے ہیں۔دو قلندر لنگوٹیاں باندھے آمنے سامنے بیٹھے بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ ہر دو منٹ کے بعد ایک قلندر کونڈی میں پانی کا چھینٹا دے کر لال لال آنکھیں بند کر کے زور سے نعرے لگاتا ہے۔

"دم دم نہ کر زرے دم نہ کردما دم قلندر بالے شاہ قلندر"

پیارے قارئین! یہ معرفتی جنگ ہے۔بڑی تیز جولاں بڑی زود رس

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ

پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ملنگ اس کے پیچھے ملنگ سامنے

نہ حد ان کے پیچھے نہ حد سامنے

یہ ازل ہی سے کشمکش میں اسیر تھی اور اب قلندروں کے دورے میں آ کر صورت پذیر ہوئی۔اسے دیکھ کر بھی نشہ چڑھ جاتا ہے اور اس کا نشہ چڑھ جائے تو آدمی درخت پر چڑھ جاتا ہے اور پھر نہ نشہ نیچے اترتا ہے اور نہ آدمی۔

سبحان اللہ! حضوری باغ کی بارہ دری میں قوالی ہو رہی ہے۔ قوال کی سرخ ٹوپی کا پھندنا وجد میں آ کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جھوم رہا ہے۔ ایک عمامہ پوش بزرگ پر حال طاری ہے۔ آپ درمیان میں بازو اٹھائے ناچ رہے ہیں اور ان کے مریدان کرام بڑھ بڑھ کر آپ کے لبادے کو چوم رہے ہیں۔ دو گھنٹے سے ایک ہی شعر بار بار پڑھتے رہنے سے قوال کی گھگھی بندھ گئی ہے اور گا بھی رہا ہے اور رو بھی رہا ہے۔ یہ پہچاننا مشکل ہے وہ گا رہا ہے یا رو رہا ہے۔ جبڑا لٹکائے نتھنے پھلائے وہ بار بار یہ شعر پڑھ رہا ہے۔

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا
لیلیٰ کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا
بعد فنا دونوں کے تھے مرقد زوا زوا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی صدا

کیا؟

عرس شریف کی بہار ہے جیا بے قرار ہے
آ جا مورے بالے شاہ تیرا انتظار ہے

قلعے کی دیوار کے نیچے بانگ دراتا کیز میں سوہنی مہینوال کھیل ہو رہا ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ سٹیج پر مسٹر مہینوال سر پر عربی رومال باندھے لنڈے کی پھولی ہوئی برجس پہنے سوہنی کی دکان کے باہر کھڑا اسے کہہ رہا ہے۔

مہینوال: سوہنی جی ذرا اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے بھانڈے (برتن) دکھائیں اور منہ مانگی مراد پائیں۔

سوہنی: مہینوال جی! اس دکان کے بھانڈے عین چوراہے میں پھوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کار جہاں درانہ نہ ہو تو کچھ ہور خریدیں۔

مہینوال: (دل پر ہاتھ رکھ کر) ہور کیا جی؟ آپ کون سی شکر قندی بیچتی ہیں؟

(ہال میں تالیوں' سیٹیوں اور چیخوں کا شور اور ایک آدمی کی آواز "ہائے میری شکر قندی)

پیارے قارئین! شکر قندی کی اس دکان کو یہیں چھوڑیں اور چلئے ذرا ضرب کلیم تھیٹر میں چلتے ہیں۔ آہا! یہاں تو ہیر رانجھا کا کھیل ہو رہا ہے۔ یہ سامنے کون کھڑا ہے۔

ارے واہ، یہ تو ہمارا ہیرو رانجھا پہلی بار ہیر سے ہمکلام ہے۔

رانجھا: اے مسکین صورت عورت! تو بھی عشق کی پناہ گیر معلوم ہوتی ہے۔

ہیر: ہاں میرے بھائی میں پناہ گیر ہوں اور مجھے جو مکان الاٹ ہوا ہے اس میں داخل ہونے کو کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ جب ہم باہر ہوتے ہیں تو اس کے اندر نہیں جا سکتے اور جب اندر پہنچ جاتے ہیں تو باہر نہیں نکل سکتے۔

رانجھا: بس بس اے ناک دراز عورت! اب میرا مغز نہ کھا اور میرے دل کو عاشقانہ خیالات سے پناہ گیروں کے مسئلہ میں نہ الجھا اور للہ اپنا نام بتا۔

ہیر: اس خاکسارہ کا نام مس ہیر چوچک ایم اے ہے۔

رانجھا: (جامہ سے باہر آتے ہوئے) ہیں ہیر، میری ہیر میری پیاری ہیر!

ہیر: ہاں میرے پیارے ویر! مگر خدا کے لئے جامے میں واپس آ جاؤ اور اپنا اسم شریف بتاؤ۔

رانجھا: (جامہ میں واپس آتے ہوئے) میرا نام رانجھا ہے اور وطن تخت ہزارہ ضلع جھنگ ڈاک خانہ خاص مگھیانہ ہے اور یہ پناہ گیر تیرے عشق میں گرفتار ہے اور شربت وصل کا طلب گار ہے۔

ہیر: لیکن میں تو بیڑیاں پیتی ہوں۔

رانجھا: اچھا تو آج کل بیڑیوں کے بنڈل کا کیا بھاؤ ہے؟

ہیر: (عینک اتارتے ہوئے) سوا چھ آنے فی بنڈل۔ ان کی تو بلیک مارکیٹ ہو رہی ہے۔

رانجھا: لیکن پیاری ہیر۔۔۔۔

ہیر: (بات کاٹ کر) پیاری کا لفظ مت استعمال کرو۔

رانجھا: تو پھر تجھے مشفق کہوں شفیق کہوں، مہربان کہوں؟

ہیر: تم مجھے صرف پری چہرہ کے سیدھے سادے لقب سے ہی پکارا کرو۔

رانجھا: آہا پری چہرہ ہیر۔ پریاں تیرے آگے پانی بھرتی ہیں یعنی تیرے مقابلے میں ماشکنیں ہیں۔ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب (سیٹھ چند لال شاہ فوراً سین بدلتا ہے اور رانجھا خاک بہ سر دیوانہ وار صحراؤں میں بھٹک رہا ہے اور گا رہا ہے)

گور مجنوں پر کسی نے جا پکارا یہ سخن

یاد لیلیٰ کی ابھی باقی ہے کچھ سوختہ تن
بھر کے ٹھنڈی سانس کھینچ کر سر سے کفن
تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے

مٹھائی چائے اور قلموں کی دکانوں پر بے حد بھیڑ ہے۔ خلیفے کبابیے کے سٹال پر جلی حروف میں خواجہ صاحب کا یہ شعر لکھا ہے۔

ہر شے ہے اصلی تے ہر چیز تازی
کیا نمک مرچیں کیا مرغ و ماہی

ان درختوں کے درمیان ایک خیمے کے اندر مجرا ہو رہا ہے اگر بتیاں سلگ رہی ہیں کچھ مگر بتیاں بھی سلگ رہی ہیں۔ گلاب کا عرق چھڑکا جا رہا ہے۔ زائرین بڑھ چڑھ کر روپے لٹا رہے ہیں۔ لمبے ناک اور ہاتھی جیسی آنکھوں والی کالی کلوٹی پری چہرہ طوائف بھدے کولہے مٹکاتی بالے شاہ کے یہ اشعار گا رہی ہے۔

گیسوئے تابعدار کو اور بھی تابعدار کر
ہم کو بھی تو شکار کر تم کو بھی تو شکار کر

مرزا خواجہ بالے شاہ کے سرہانے کی طرف جالیوں کے پاس عقیدت مندوں کا ہجوم ہے۔ لوگ لب خشک آنکھیں بند کئے اور ہاتھ اٹھائے منتیں مانگ رہے ہیں' دعائیں مانگ رہے ہیں۔

ایک آدمی: یا خواجہ! تیری نگری میں کالے کوس سے آیا ہوں۔ اب کے لڑکا پیدا ہو۔ اب کے مراد بر آئے۔ اگلے عرس پر کھیر پکاؤں گا۔

ایک عورت: میرے بیٹے نے (آہستہ سے) پھر چرس پینی شروع کر دی ہے۔ تم ظاہرا پیر ہو۔ اس کی چرس چھڑا دو تو میں تیرے سارے قلندروں کو چرس پلاؤں۔

ایک بوڑھا: (دیہاتی ہے) بھوری بھینس پھر امید سے ہے۔ میری آرزو بر آئی میں سوا پانچ آنے چراغی ڈالے جاتا ہوں۔

جواری: آج پھر گاماں سارا مال جیت گیا ہے۔ میرے خواجہ! آج پھر تیرا یا لکا پھانک ہے۔

سٹے باز: ہے پیر بالے شاہ! لوگ کہتے ہیں تو شعر باز بھی تھا تو پھر میرے کان میں بتا دے آج رات کون سا حرف لگاؤں؟

ایک مریض: سچے پیر! پھر کالی کھانسی آ رہی ہے۔

دوسری طرف سجادہ نشین کے حجرے میں لوگوں کا ہجوم ہے۔مجاوران کرام حضرت خواجہ بالے شاہ کے بعض شعر گلاب کے عرق سے کاغذ پر لکھ لکھ کر حاجت مندوں میں یہ ہدیہ سوا تین روپے فی شعر بانٹ رہے ہیں۔ایک بوڑھی عورت آنکھوں پر ہاتھ رکھے مجاور سے پوچھ رہی ہے۔

بیٹا: یہ تعویذ کونسے عرق کے ساتھ پینا ہے؟''

مجاور کہہ رہا ہے۔''بڑی مائی اسے پینا نہیں بازو پر باندھ لینا۔''

پرلی طرف عین مزار کے عقب میں بڑا سجادہ نشین سر پر سبز عمامہ باندھے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زائرین کو (یہ ہدیہ سوا روپیہ فی زائر) بالے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے ایک مسودہ کی زیارت کروار ہے ہیں۔ یہ مسودہ خواجہ صاحب کے پرانے کلام کا بچا کھچا نمونہ ہے۔لوگ بڑی عقیدت سے بوسیدہ اور خستہ ورق کو فرط عقیدت سے آنکھیں بند کر کے دیکھتے ہیں اور سبحان اللہ ورد کرتے واپس آ جاتے ہیں۔اس کرم خوردہ مسودے پر صرف یہ مصرعہ پڑھا جاتا ہے۔:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

اور پھر پیارے قارئین! اچانک میری آنکھ کھل گئی اور کیا دیکھتا ہوں کہ میں علامہ اقبال کے مزار پر بالکل اکیلا کھڑا ہوں اور اپنے دوست کی بات پر غور کر رہا ہوں۔جس نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھے کہا تھا۔

''اور جب مجھے اقبال کا وہ شعر سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اس کے مزار پر پہنچ کر فاتحہ پڑھی دعا مانگی اور جب گھر آیا تو شعر کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔''

◆◆◆

باقی پردہ سیمیں پر

استاد نکی پہلوان نے دھوتی کرتہ اتارا اور اپنے ساتھیوں کو دیا۔ جانگیا اوپر کر کے ران پر ہاتھ مارا اور علی کا نعرہ لگا کر دس آنے والی کھڑکی کے سامنے لوگوں کے ہجوم کے اوپر چھلانگ لگا دی۔ چھ آدمیوں کے ٹکٹوں کے پیسے اس کے منہ میں تھے۔ لوگوں کے سروں پر دوڑتا ہوا وہ دیکھتے دیکھتے کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ ان مشتاق نٹوں کی طرح جو تنی ہوئی رسی کو ایک ہی جھکولے میں پار کر جاتے ہیں۔ لوگوں نے شور مچایا جن کے کندھوں اور سروں پر سے نکی پہلوان کا بھاری بھرکم ٹرک گزرا تھا۔ انہوں نے درد سے بلبلا کر آہ و بکا بلند کی۔ ایک دبلے پتلے کن میائے نے دور ہی دور سے نکی پہلوان کو گھونسہ دکھایا اور کھلے میدان میں مبارزت کی دعوت بھی دے ڈالی مگر پہلوان نے سنی ان سنی کرتے ہوئے منہ کھول کر رقم نکالی اور کھڑکی کے اندر ہاتھ گھسیڑ دیا۔

''چھ زناب!''

اس دھکم پیل کو ایک سپاہی گنڈیریاں چوستے ہوئے دور ہی دور سے دیکھ رہا تھا آخری گنڈیری کے چھلکے سے اچھی طرح دانت صاف کرتے ہوئے اس نے ایک زوردار ڈکار لیا اور آتے ہی لوگوں کو قطار میں کھڑا کرانے کے لئے ہوا میں ڈنڈا برسانے لگا۔ اس دوران میں نکی پہلوان دھوتی کرتہ دوبارہ پہن کر اپنی پوری ٹولی کے ساتھ سینما ہال کے اندر بیٹھ چکا تھا اور دھڑا دھڑ چھیرے نوش جان کر رہا تھا۔ باہر لاہور کی آگ برساتی دوپہر تپی ہوئی تھی۔ اندر بھی کوئی خاص ٹھنڈک نہ تھی۔ اگرچہ پنکھے چل رہے تھے۔ مگر ان کی ہوا اس قدر گرم تھی کہ نکی پہلوان نے دھوتی رانوں تک کھسکا لی اور کرتہ اتار کر سر پر رکھ لیا۔ ریکارڈنگ کی تیز آواز میں لوگوں کا شور دب گیا تھا۔ پورے چار ہو رہے تھے لیکن فلم شروع ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ آخر فسٹ کلاس والوں کی پے در پے سیٹیوں' سیکنڈ والوں کی آوازوں دس آنے والوں کی زوردار ''بھڑکوں'' سے مجبور ہو کر فلم شروع کر دی گئی۔ فلم پنجابی تھی۔ پہلے ہی منظر میں فلمی دیہاتوں کی ایک دوشیزہ خالص لاہور کا فیشن ایبل غرارہ سیٹ زیب تن کئے سنتھال عورتوں کی مانند بالوں کے جوڑے پر موتیے کے کاغذی پھولوں کا جھاڑ سجائے۔ سرخی پاؤڈر ہار سنگار اور دیگر فلمی لوازمات سے لیس ہو کر طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار کھیتوں میں ناچتی گاتی نظر آئی۔ کبھی کمر پر ہاتھ رکھ کر کولہے مٹکاتی کبھی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے گردن پچکاتی جیسے دیکھ رہی ہو۔ کہیں مٹکاتو

نہیں ٹوٹ گیا۔ اتنے میں ریت کی دیوار کے پیچھے سے ہیرو نمودار ہوئے۔ ریشمی لاچا' ریشمی قمیض انگریزی فیشن کے بال۔ ہاتھ میں بانسری انہوں نے بھی ہیروئن کے ساتھ مل کر گانا اور راک اینڈ رول ناچنا شروع کر دیا۔ دو ایک بار انہوں نے بھی گردن لچکا کر اپنی گردن کے منکے کی خیریت دریافت کی۔ جب دونوں اس ''اونٹ رقص'' سے تھک کر نڈھال ہو گئے تو بیٹھ کر عشق و محبت کا اظہار کرنے لگے۔

ہیروئن بولی۔

''میں آج بہت خوش ہوں مراد بہت خوش' یوں لگتا ہے جیسے میری خوشی کی کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔''

''میں تمہیں ایک اور خوش خبری سناتا ہوں۔ گامو! چاچی ہماری شادی پر راضی ہو گئی ہے۔''

''سچ' سچ مراد؟''

''ہاں گامو۔ لیکن اس نے کہا ہے پہلے مجھے شہر جا کر کوئی اچھی سی نوکری تلاش کرنی ہوگی۔''

''لیکن مراد میں تمہاری جدائی کیسے برداشت کروں گی؟''

''میرا شہر جانا بڑا ضروری ہے۔ یہ صرف چاچی کی خواہش ہی نہیں' اس فلم کے ڈائریکٹر کا بھی حکم ہے۔ کیونکہ میرے شہر جائے بغیر ہماری شادی ہو سکتی ہے اور نہ ہی فلم کبھی ختم ہو سکتی ہے۔ میری عدم موجودگی میں یہاں گاؤں میں ایک ویلن جنم لے گا جو تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لاکھ جتن کرے گا۔ تم ہمیشہ اس سے بچنا اور اس کے سامنے میری محبت کے نعرے بلند کرنا اور ڈرنا نہیں۔ وہ عورتوں سے ہمیشہ پٹتا رہا ہے۔''

اور مراد' شہر میں جو ویمپ تمہیں ملے گی تم اس سے بھی خبردار رہنا۔ اگر تم اس سے شادی کی غلطی کر بیٹھے تو نہ صرف یہ کہ اپنی فلم فیل ہو جائے گی بلکہ ہمیں اگلی فلم میں کام بھی نہیں ملے گا۔''

؟تم بے فکر رہو۔ لو آؤ۔ اب جدا ہونے سے پہلے ایک دردناک گیت گا کر تماشائیوں کے دلوں کو گرمائیں اور ہاں یاد رکھنا اس گیت میں تمہیں اکتیس بار کولہے مٹکانے ہیں اور پندرہ بار کولہے اچکانے ہیں۔''

چنانچہ جب یہ دردناک گیت بلکہ دردناک ڈانس شروع ہوا تو لوگوں نے فرط مسرت سے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ اب ہیرو شہر میں آ گیا ہے۔ یہاں دو ایک دن اسے سڑکوں کی خاک اڑاتے دکھایا جاتا ہے۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ لیکن شیو ہر روز ہوتی ہے۔ یہاں اس کا حلیہ بھی بدل گیا ہے۔ ریشمی لاچے کی جگہ تنگ پائنچے کی کھڑی پتلون اور ڈوری دار چیک بشرٹ نے لے

لی ہے۔ جب اسے بھوک بہت ستاتی ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے اور جیب سے ماؤتھ آرگن نکال کر بجانے لگتا ہے۔ یہاں اسے ایک کامیڈین بھی مل جاتا ہے۔ جو بات بات پر جبڑے کھینچ کر آنکھیں چڑھا کر منہ پھلا کر دانت نکال کر مٹکا مٹکا کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ پروگرام کے مطابق اسے ایک کوٹھی میں بیراگری کی نوکری مل جاتی ہے۔ جہاں پروگرام کے مطابق ویمپ پہلے سے ہی موجود ہے۔ اب جیسا کہ ہیرو نے اپنے مکالمے میں بیان کیا تھا۔ ویمپ اسے پھنسانے کے جتن کرتی ہے اور ہیرو فارمولے کا سرخ کھیس لے کر ہسپانوی بل فائٹروں کی طرح ویمپ کے بھینسے سے مقابلہ کرتا ہے۔ ادھر ویلن صاحب ڈائریکٹر کا اشارہ پاتے ہی گلے میں منکے ڈال کر نتھنے پھلا۔ بار بار ریشمی صافہ کندھوں پر جھٹکاتے سینہ چوڑا کر کے پالا مار کر آئے ہوئے مرغ کی طرح ہیروئن کے گرد چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ ایک بار ہیروئن کو اٹھا کر بھی لے جاتے ہیں۔ ہیروئن فوراً ڈانگ لے کر میدان عمل میں کود پڑتی ہے۔ بڑی شاندار فائٹنگ ہوتی ہے۔ ماسٹر چھوٹے خان بھنگڑا کے سکھائے ہوئے سارے داؤ پیچ استعمال کے بعد ڈھیلے کر دیئے جاتے ہیں۔ وارڈ نمبر 11 کے ذریعے ہیروئن لاٹھی کے اڑنگے سے بیک وقت تین ایکسٹرا جوانوں کو آن کی آن میں زمین پر چت گرا دیتی ہے۔ سوا سو کا کنٹریکٹ اور مہینے بھر کی دوڑ دھوپ لو کے تھپیڑے چلچلاتی دوپہریں' دروازوں کے باہر تھکا دینے والا انتظار پیسوں کے تقاضے شوق کی فراوانی' راستوں کی دوڑ ہدایت کار ہیروئن اور پروڈیوسروں کی جھڑکیاں بہت زیادہ خوشامد بہت تھوڑی کامیابی اسٹوڈیو کے بے ثمرات چکے' کوٹھیوں کے طواف' دفتروں میں حاضری' چھوپاسی زندگی اور عبور۔

عبور دریائے شور!

شہر میں ہمارے ہیرو کو صبح سے رات گئے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن وہ ہیروئن کی یاد میں درد ناک گیت گانے کا وقت کمال ہوشیاری سے نکال لیتا ہے۔ ویسے وہ بہرا ہے مگر شام کو کالا سوٹ اور کالی بو لگا کر کلب ضرور جاتا ہے۔ کلب میں ایک اور لڑکی اس کے دام محبت میں پھنسا دی جاتی ہے۔ اس لڑکی کا چکر الگ چلتا ہے اور ویمپ کا چکر الگ۔ ان چکروں سے تنگ آ کر نکلی پہلوان دو تین بار زبدشکن بلکہ کرسی شکن انگڑائیاں لیتا ہے۔ ایک بار اپنی کھوپڑی پر زور سے گھونسہ مارتا ہے' ٹانگیں کھجاتا ہے' اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں کے سر دبوچ کر انہیں آپس میں ٹکراتا ہے۔

ادھر گاؤں میں ہیروئن باقاعدہ گانے گاتی رہتی ہے جب بھی اسے کوئی کام نہیں ہوتا فوراً چست قمیض پہن لاچا باندھ جسم کے خطوط ابھار کر کھیتوں میں آ کر ناچنا اور گانا شروع کر دیتی ہے۔ کبھی وہ ایک پاؤں پر ناچتی ہے اور کبھی دھوپ سے زمین پر گر کر ٹانگیں چلانے لگتی ہے۔ وہ پنجاب کے ان غیرت مند کسانوں کی بیٹی بن کر طوائفوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں تھرکتی پھرتی ہے۔ جو ایسی

بے حیا بیٹیوں کے باپ کہلوانے سے مرجانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔جن کی بیٹیوں کی کوئی نامحرم آواز تک نہیں سن سکتا۔فلم میں ان کی لڑکیاں کوٹھوں پر چڑھ کر کھلے بندوں اپنے محبوب کے ہجر میں فحش گانے گاتی ہیں۔جو باپ گھوڑے کی ہنہناہٹ پر جاگ اٹھتا ہے۔اس کی لاڈلی ساتھ والے کمرہ میں گھگھو ہیرو کے ساتھ گلے کی ساری رگیں پھلا کو ڈوئیٹ گا رہی ہوتی ہے اور باپ چادر تان کر خراٹے لے رہا ہوتا۔ہیروئن جب گانا گا چکتے ہیں اور دبی دبی سرگوشیوں میں عشق و محبت کی باتیں شروع کرتے ہیں تو ہیروئن بار بار ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے سے کہتی ہے۔

''شی آہستہ بولو۔بابا کی نیند بڑی کچی ہے۔

لیکن فلمی بابا سو رہا ہے گھوڑے بیچ کر۔

عزت بیچ کر!

ہیرو کو نوکری مل گئی ہے۔وہ شادی کے لئے گاؤں آتا ہے۔لیکن اس وقت فارمولا نمبر سات کے تحت رکوادی جاتی ہے اور جدائی کی خلیج حائل ہو جاتی ہے جس میں تماشائی اس وقت تک ڈبکیاں لگاتے ہیں تا آنکہ راستہ پھر سے ہموار نہیں ہوتا۔کہانی کلائمیکس کے قریب پہنچ رہی ہے ایک زبردست رقص کا انتظام کیا جاتا ہے۔

ہیروئن نیم عریاں لباس میں لوگوں کے ہجوم میں محو رقص ہو جاتی ہے۔اس نے ڈائریکٹر اور ڈانس ماسٹر جھنگڑا کی ہدایات کے مطابق آپے سے باہر ہو کر رقص کیا۔رقص کیا تھا۔بس یوں لگتا تھا کہ ایک چھوٹی سی ہتھنی ہے جو اپنی سونڈ اوپر اٹھا لیتی ہے۔اور اٹھاتے ہی رکھ دیتی ہے اور پھر فوراً ہی اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔سینما ہال کے جنگل میں بیٹھے ہوئے تماشائی اس ڈانس سے خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ایک بار ہتھنی نے پورا زور لگا کر مٹکائی تو نکی پہلوان کے منہ سے بے اختیار ایک ''بھڑک'' نکل گئی۔اس نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے اٹھ کر ایک خالی کرسی اٹھائی اور اسے پوری طاقت سے دوسری خالی کرسی دے مارا۔دونوں کرسیاں چکنا چور ہو گئیں۔جب آتش عشق اس پر بھی فرو نہ ہوئی تو نکی پہلوان نے اپنا پیٹنٹ نسخہ استعمال کیا۔یعنی پورے جوش میں آ کر اپنی ٹانگ پر ایک زبردست گھونسہ جمایا اور اطمینان سے بیٹھ کر کھیرا کھاتے ہوئے ہتھنی کا ڈانس دیکھنے لگا۔

کہانی کا کلائمیکس آ گیا۔میدان کارزار ہیروئن کے مکان پر گرم ہوا۔ہیروئن کی شادی بدکردار ویلن سے زبردستی ہو رہی تھی کہ ہیرو اپنے کامیڈین ساتھی کے ہمراہ پولیس لے کر پہنچ گیا۔

ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ ولن قاتل تھا۔ یہ قتل ڈائریکٹر نے اپنی سہولت کے لئے کہیں فلم کے پس منظر میں ہی کروا دیا تھا۔ جس کا سوائے ہیرو کے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ ولن بھاگ اٹھا۔ ہیرو نے اسے دبوچ لیا۔ لڑائی شروع ہوگئی۔ بڑی پر تکلف لڑائی تھی۔ ولن بڑی فراخدلی سے ہیرو کا ہر گھونسا اپنے کلوں پر لیتا تھا۔ بیک گراؤنڈ میوزک نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

ڈن ڈم۔ ڈن ڈنڈم ڈنڈم۔

ولن نے ہیرو کی جانب چھری اچھالی۔ ویمپ جو قربانی کی بڑی شوقین تھی سامنے آگئی اور اپنی قربانی کے مسئلہ پر ڈائیلاگ کے ذریعے پوری روشنی ڈال کر جاں بحق ہوگئی۔ ولن کے ساتھی نے چھری پھینکی۔ اب کے کامیڈین نے قربانی پیش کی۔ تیسری چھری ہیرو کی ماں کو لگی۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ ولن نے چوتھی چھری اچھالی جو پروگرام کے مطابق ہیرو کی ہمشیرہ صاحب نے اپنے سینے میں اتار لی۔

قریب تھا کہ ولن ہیرو کے سینے میں چاقو گھونپ دے کہ نیم جان کامیڈین نے کانی آنکھ سے اس طرف دیکھا اور اپنے سینے سے چھری نکال کر ولن کی پشت میں پیوست کردی چیخ کی آواز کے ساتھ ہی ولن ٹھنڈا ہوگیا اور ساتھ ہی ایکدم پرشور بیگ گراؤنڈ میوزک بھی بند ہوگیا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے ڈائریکٹر نے ایک چھری میوزک ماسٹر کی طرف بھی اچھال دی ہو۔ لاشوں کے درمیان ہیرو اور ہیروئن کا بیاہ ہوگیا اور فلم ختم ہوگئی۔

نکی پہلوان کے ساتھی دھوتیاں جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ایک ساتھی سو گیا تھا۔ اسے ڈانڈ پر دھپا مار کر جگایا گیا۔ نکی پہلوان نے ایک زبردست جمائی لی ور نعرہ مارا۔

”ہیت تیرے فلم بنانے والے کی خیر ہو۔“

اس کا ساتھی صافہ باندھتے ہوئے بولا۔

”پانچ کی ڈز پڑ گئی مولا۔“

نکی پہلوان کمر پر ہاتھ رکھ ہیروئن کی طرح کولہے مٹکاتا باہر نکل گیا۔ باہر دوسرے شو کے لئے دس آنے والی کھڑکی پر لوگوں کا ہجوم تھا اور ایک دوسرے پہلوان نما آدمی کا ٹرک لوگوں کے سروں پر سے گزرتا ہوا کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔

◆◆◆

حضرت دلخراش لاہوری

فلمی کہانی نویس نے پروڈیوسر کے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بالوں کو جھٹک کر ماتھے پر پریشان کیا۔ لمبے کوٹ کی جیب میں سے جم خانے کی بوتل نکال کر ایک چسکی لی۔ سگریٹ سلگایا۔ آنکھوں میں ایک دردانگیز کیفیت پیدا کی اور بڑے لاابالی انداز سے دروازے پر دستک دی۔ اس سے پہلے کہ دروازہ کھلے ہیں ذرا اس فلمی کہانی نویس کا مختصر سا شجرہ نسب بیان کر دوں۔

آپ کا نام حضرت دلخراش لاہوری ہے۔ آپ کے والد بزرگوار جناب دلتراش لدھیانہ میں کوچوانی کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور تشریف لائے اور یہاں انہوں نے آزاد علاقے سے چرس اسمگل کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔ آپ کے صاحب زادہ حضرت دلخراش کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ لیکن اسمگلنگ میں اپنے باپ کے دست راست تھے۔ کچھ لوگوں کے کہنے سننے پر آپ نے حضرت دلخراش کو سکول میں داخل کروا دیا۔ جہاں انہوں نے پندرہ برس میں دس جماعتیں پاس کیں اور ایک اخبار میں خبروں کے ترجمہ کی مشق شروع کر دی۔ ابھی انہیں یا ان کے نیوز ایڈیٹر کو تختہ مشق بنے پورا ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ آپ پر اچانک افسانہ نویسی کا حملہ ہوا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ آپ پھر صحت یاب نہ ہو سکے۔ اب ان کا کام دن بھر کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کا چکر لگانا۔ بال بکھیرنا' آنکھیں مست بنانا' سگریٹ منہ میں دبا کر مال کے پیدلوں پر آوارہ گردی کرنا' باغوں اور سینما گھروں کی لابیوں میں کھڑی لڑکیوں کو گھور گھور کر دیکھنا اور مختلف لڑکیوں کے نام سے افسانے لکھ لکھ کر انہیں رسالوں اور اخباروں میں چھپوانا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھنے کا موقعہ تو انہیں ملتا ہی تھا۔ چنانچہ آپ کو چند ایک غیر ملکی ادیبوں اور ان کی کتابوں کے نام ازبر ہو گئے تھے۔ آج صبح صبح گھر سے شیلے یا موپساں کی کوئی کتاب بغل میں دبا کر گھر سے نکلتے۔ محلے میں حلوائی کی دکان سے لسی پیتے' بس میں سوار ہوتے' اور سیدھا کافی ہاؤس پہنچ کر کونے والی میز پر اڈہ جما لیتے اور اندھا دھند موپساں کے افسانوں یا شیلے کی نظموں کا قتل عام شروع کر دیتے۔ کافی ہاؤس میں ایک روز آپ کی ملاقات ایک ایسی فلمی شخصیت سے ہو گئی جس کے پاس فلم کے گانے سیٹ کے خاکے' سینریو اور کہانی بالکل تیار تھی۔ صرف فنانس اور مکالمے باقی تھے۔ حضرت دلخراش نے فوراً مکالمے لکھنے کی پیش کش کر دی۔ جو فوراً قبول کر لی گئی۔ اس طرح حضرت دلخراش لاہور فلم انڈسٹری میں آن وارد ہوئے۔ آپ اپنے ساتھ خالی

دماغ ہی نہیں بلکہ غیر ملکی مصنفوں کی کتابوں سے لدا ہوا ایک گدھا بھی لائے۔ چنانچہ آپ نے صرف فلمی اشتہار پڑھنے والوں کے سامنے بیٹھ کر روس اور فرانس کے ادیبوں کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ حضرت دلخراش کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ باتیں بنانے کے فن میں دلخراش نے بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ مکالمے لکھتے کم اور بولتے زیادہ تھے۔ کتابیں پڑھتے کم اور کھاتے زیادہ تھے۔ صبح ناشتہ کی میز پر آسکر وائلڈ یا کرشن چندر کی کہانی کو مکھن لگا کر کھا جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آسکر وائلڈ یا کرشن چندر موصوف کو ہضم نہ ہوتا تھا۔ اور پروڈیوسر ایسا ہضم ہوتا تھا کہ پھر اس کی صورت میں کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور حضرت دلخراش دفتر میں تشریف لے گئے۔ اندر ایک ڈرائیور صورت شاعر صوفے پر بیٹھے بظاہر فکر سخن میں غرق تھے لیکن حقیقت میں انتہائی بے چینی کے عالم میں پروڈیوسر ڈائریکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ کا تخلص حضرت ستمگر کاس گنجوی تھا۔ آپ کو ایک مشہور ایکٹرس کے قرب کا شرف حاصل تھا۔ جس کی وجہ سے فلم انڈسٹری کے لوگ آپ کے شعروں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت دلخراش کو دیکھ کر حضرت ستمگر نے بڑھ کر مصافحہ کیا ہی تھا کہ پروڈیوسر صاحب پچھلے کمرے سے اندر تشریف لے آئے۔ اب کہانی اور کہانی کے اہم مقامات پر بحث شروع ہو گئی۔ دلخراش نے اپنی باتوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ جم خانہ کی چچکی تو لگی ہوئی تھی اوپر سے انہوں نے بات بات پر روسی، فرانسیسی اور انگریزی مصنفوں کے دھڑا دھڑ نام گنوانے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ستمگر کو اس وقت اپنی دال گلتی نظر نہ آئی اور وہ اجازت لے کر چل دیئے۔ اب پروڈیوسر اور حضرت دلخراش رہ گئے۔ پروڈیوسر نے کہا:

''دلخراش صاحب! میں ایک ایسی اسٹنٹ فلم تیار کرنا چاہتا ہوں جس میں کچھ جادو اور طلسم کی آمیزش بھی ہو۔ یعنی ہیرو لڑتا لڑتا اچانک جادو کے زور سے ولن یا ویمپ کی بکری بنا دے۔''

حضرت دلخراش نے میز پر مکا مار کر کہا۔

''یہ کونسی بڑی بات ہے۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ ٹالسٹائی کے ایک ناول کا ہیرو بالکل اسی قسم کی حرکتیں کرتا ہے۔ مثلاً اس کے مشہور ناول ''نانا'' میں جب ہیروئن ہیرو کی مرمت کر کے اسے افریقہ کے جنگلوں میں جلاوطن کروا دیتی ہے تو وہ ایک جنگلی سے جادو کے کمالات سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایک روز الو بن کر اڑتا ہوا عین اس وقت ہیروئن کے مکان میں داخل ہو کر اس کی آنکھیں نکال کر لے جاتا ہے جب کہ اس کی شادی ہو رہی ہوتی ہے۔

پھر ہیروئن سور داس بن کر جنگل میں نکل جاتی ہے اور صحرائے عرب میں ہیرو سے ملاقات کرتی ہے۔ جب کہ وہ شخص یہودی

جہازرانوں سے مل کرافیون اورحشیش کی اسمگلنگ کا کام کر رہا ہوتا ہے۔"

"سبحان اللہ! یہ سچو ایشن ہماری فلم کو بڑی سوٹ کرے گی۔ دلخراش صاحب اسے ضرور رکھے گا۔"

"اجی یہ کیا۔ اس سے بہتر چیزیں آئیں گی۔ ابھی تو میں نے لارڈ بائرن کی مافوق الفطرت کہانیوں کی ٹچ نہیں کیا۔ اس کے پلاٹ تو جادو کے کمالات میں شیلے کے ناولوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

پروڈیوسر نے فوراً 500 روپے کا چیک لکھ کر حضرت دلخراش کو دیا اور فلم کی کہانی سینر یو اور مکالموں کا کنٹریکٹ ہوگیا۔ آپ نے سب پہلے بنک میں جا کر چیک بھنوایا۔ کافی ہاؤس جا کر کافی پی۔ پہلے بلوں کی ادائیگی کی۔ جم خانے کی بوتل خریدی اور گھر آن کر وہ رجسٹر کھولا۔ جس میں ہر قسم کی کہانی کے ہر قسم کے سین کے مکالمے دوسرے لوگوں کی کتابوں سے نقل کئے ہوئے تھے۔ "ج" کے خانے میں آپ نے جادو کا صفحہ نکالا۔ سامنے فلم کا نام "جادو کا ڈنڈا" لکھا تھا۔ آپ نے سینریو کے ساتھ ہی ساتھ مکالمے بھی لکھنا شروع کر دیئے۔ پہلا منظر یہ تھا کہ ایک جادوگر اپنی لیبارٹری میں کوئی سیال شے تیار کر رہا ہے کہ اچانک ایک چڑیل نمودار ہو کر جادوگر سے اس کا خون مانگتی ہے۔ جادوگر انکار کرتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن مکالموں کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک مکالمہ نیزہ نکالتا ہے۔ دوسرا تلوار کھینچ لیتا ہے اور دونوں مکالموں میں جنگ ہونے لگتی ہے۔ پہلا مکالمہ دوسرے کی پشت میں نیزہ پیوست کر دیتا ہے۔ دوسرا مکالمہ بلبلا کر گرتا ہے اور وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سین بھی دم توڑ دیتا ہے۔

آپ نے جڑانوالہ کے ایک پروڈیوسر کو قدیم روم اور یونان کی دیومالا کی کہانیاں سنا کر لٹو کر رکھا تھا۔ یہ کہانیاں حضرت دلخراش نے اپنے ایک دوست سے سن کر رجسٹر نمبر 5 میں نقل کر رکھی تھیں۔ چنانچہ آپ ساتھ ہی ساتھ جڑانوالہ کے پروڈیوسر کے لئے "عشق کیوپڈ" کے نام سے ایک فلم بھی لکھ رہے تھے۔ اس فلم کے سین نمبر 30 کے لئے آپ نے رومانی ڈائیلاگ یوں لکھے۔

کیوپڈ: سائیکی! مت بھولو تم میری محبوبہ ہو۔

سائیکی: محبوبہ کہہ کر مجھے عرق انفعلال سے پانی پانی نہ کرو۔

کیوپڈ: پانی کا نام لے کر جلتی پر تیل نہ پھینکو۔

سائیکی: تمہاری جوانی کی شراب جذبات کی بھٹی پر کشید ہوئی ہے۔ تمہارے جذبات کا حمام عشق کے انگاروں پر گرم ہوا ہے۔ تمہاری محبت کے انگارے حسن کے شعلوں میں سرخ ہوتے ہیں اور تمہارے گالوں کی سرخی کشمیر کے سیب کا چربہ ہے۔ اور تمہارے جسم کی چربی لبنان کے دودھ اور عرب کے مکھن کی مرہون منت ہے۔

سائیکی: زبان سنبھال کر میری تعریف کرو کیوپڈ!

کیوپڈ: میں بہت کچھ سنبھال کر کر رہا ہوں۔ سائیکی حسن کے روبرو عشق کی زبان کا تالا تڑاخ سے اپنے آپ کھل جاتا ہے اور احساسات کی عیاری چوک میں بکھر جاتی ہے۔ لوٹو لوٹو میرے دل کی دنیا کو اتنا لوٹو کہ تمہیں پھر لوٹنے کی اور مجھے لٹوانے کی ہوش باقی نہ رہے۔

(سائیکی کھانستی ہے)

کیوپڈ: آہ کھانسو کھانسو! اتنا زور سے کھانسو کہ تمہارے پیٹ کی انتڑیاں اور دل کا موتی اور سامنے کا پتھر باہر آن گرے۔

یہاں آ کر سائیکی گر پڑتی ہے اور کیوپڈ اس کی ٹانگ پر تیر چلاتا ہے۔ حضرت دلخراش صاحب کیوپڈ کا پارٹ۔ بہ نفس نفیس خود ادا کر رہے ہیں۔ اگرچہ آپ کی صورت بھٹے سے سسکتی جانے والی پھٹیچر بس کے کلینر ایسی بھی نہیں۔ آپ کے پاس ایک سوشل فلم بھی زیر تعمیر ہے۔ اس فلم کا موضوع ایک کوچوان کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جو سماج سے بغاوت کر کے پہلے ڈاکو اور پھر حجام اور پھر ایکسٹرا بن جاتا ہے۔ اس کی محبوبہ کی ڈولی ایک سرمایہ دار کے گھر جا رہی ہے۔ کوچوان ہیرو برات کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھ پھیلائے پہلے تو حضرت ستمگر کا ایک ستم ڈھانے والا گیت گاتا ہے۔ براتی سن رہے ہیں اور رو بھی رہے ہیں۔ پھر وہ دلہن سے مخاطب ہو کر ذیل کے مکالمے بولتا ہے۔

ہیرو: میرا تانگہ چھوڑ کر سرمایہ دار کی کار میں بیٹھنے والی سواری تو نے سماج کی پیٹھ پر سانٹا مارا ہے۔ تو نے عشق کی گاڑی کا دھرا نکال دیا ہے۔ تو نے محبت کی ٹمٹم کے دونوں بم توڑ دیئے ہیں۔ تو نے میرے پائیدان کا سہارا لے کر دولت مند کی گاڑی پر چھلانگ لگائی ہے۔ تو نے میری وفا کی دونوں بتیاں گل کر دی ہیں۔ آہ میرا تانگہ جذبات کی سواریوں کو لئے منزل مقصود کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ کو تو نے سپاہی بن کر میرا چالان کر دیا ہے۔

اے چوک کی بجھی ہوئی بتی! اب تیرے چبوترے پر کوئی سپاہی کھڑا نہیں ہوگا۔ اب تجھے موچی دروازے سے لوہاری اور لوہاری سے ٹکسالی تک کوئی تانگہ نہ ملے گا۔

مکالمہ ادا کرنے کے بعد کوچوان گر پڑتا ہے اور براتی اسے ایک تانگے میں بٹھلا کر پاگل خانے پہنچا دیتے ہیں۔

حضرت دلخراش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ مکالمہ لکھتے وقت ماحول کی چٹکیاں ہی نہیں لیتے۔ بلکہ ماحول میں گم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کوچوان کی کہانی کے مکالمے آپ نے ایک اصطبل میں بیٹھ کر لکھے تھے۔ اور ایک بیمار گھوڑے سے بعض

مفید مشورے بھی لئے تھے۔ آپ ماحول میں اس درجہ تحلیل ہو چکے تھے کہ جب آپ کو مکالموں کا معاوضہ ملا تو فرط مسرت سے آپ بے اختیار ہنہنا اٹھے۔

◆◆◆

علی بابا اور چالیس چور

(ریاست چنگڑ پور والے)

اور جب رات گہری ہوگئی اور بغداد کے تنگ تاریک گلی کوچوں میں اندھیرا چھا گیا تو تو علی بابا گدھے پر سوار ہو کر اپنی پرانی حویلی کے محرابی دروازے میں سے باہر نکلا اور چالیس چوروں کے غار کے طرف روزانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ چور اس وقت لوٹ مار کے لئے جا چکے ہوں گے اور وہ بڑی آسانی سے زر و جواہر اور مال و دولت لاد کر شاداں و فرحاں واپس لوٹ آئے گا۔ اس خیال سے وہ بڑا خوش تھا۔ چنانچہ جب وہ شہر سے کافی دور ویران کھنڈروں میں سے گزرا تو خوشی سے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور مدھم سروں میں گنگنانے لگا۔ غار کے پاس پہنچ کر علی بابا گدھے پر سے اتر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور زوردار آواز میں کہا۔

''کھل جا سم سم!''

ایک گرجدار گڑگڑاہٹ سی سنائی دی اور غار کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔ جب دروازہ پوری طرح کھل گیا تو علی بابا فرطِ مسرت سے جھومتا جھامتا گدھے کو کان سے پکڑ کر گھسیٹتا غار کے اندر داخل ہو گیا۔ غار کا موڑ مڑتے ہی علی بابا کی گھگھی بندھ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے چالیس چور منڈلی جما کر بیٹھے ہیں۔ ایک رقاصہ درمیان میں رقص کر رہی ہے اور شراب کا دور چل رہا ہے۔ چوروں کے سردار نے علی بابا کو دیکھ لیا تھا۔ علی بابا کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور داڑھی سکڑ گئی تھی۔ سردار نے دور ہی سے علی بابا کو پکارا۔ ''علی بابا بے دھڑک چلے آؤ۔ اب یہ غار چوروں اور ڈاکوؤں کا نہیں رہا۔''

علی بابا کانپتا ہوا اس منڈلی کی طرف بڑھا۔ چوروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور سردار نے علی بابا کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کا جامِ صحت تجویز کیا۔ محفل، شور ہلڑ بازی اور نعروں سے گونج اٹھی۔ سردار نے علی بابا کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ علی بابا کی پگڑی کھل کر گلے میں آن پڑی۔ سردار بولا۔

''فکر نہ کرو میں تمہیں پگڑی کی بجائے ایک سنہرا تاج پہناؤں گا۔ اب میں ڈاکوؤں کا سردار نہیں بلکہ ایک ریاست کا وزیر ہوں

اور یہ میرے چور دوست اب میرے نائب وزیر ہیں کیوں دوستو!''

اس پر سب نے مل کر فلک شگاف نعرے لگائے۔

''شاہ ریاست چنگڑ پور زندہ باد' پائندہ باد!''

علی بابا پہیم کر چپکا بیٹھا رہا۔ سردار نے جام بھر کر علی بابا کو پیش کیا۔

''ریاست چنگڑ پور کے بادشاہ نے مجھے وزیر اعظم چن کر مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ میرا حق تھا۔ ملک وقوم کے لئے میری خدمات کی فہرست اتنی لمبی اور پرانی ہے کہ مجھے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علی بابا تم بڑی مدت بعد اس غار میں آئے ہو۔ اس لئے تمہیں تازہ ترین سیاست کا علم نہیں۔ پہلے تم یہاں آ کر ہمارے زر و جواہرات لوٹ کر لے جاتے تھے اور ہم تمہاری تلاش میں تھے۔ اگر میرے وزیر اعظم اور میرے چوروں کے نائب وزراء بننے سے پہلے تم ہمیں مل جاتے تو تمہاری تکا بوٹی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ لیکن میرے بھائی اب ہم نے لوٹ مار سے توبہ کر لی ہے اور ملک وقوم کی خدمت کے حلف اٹھا لئے ہیں۔ بلکہ حال ہی میں ہمیں ہماری عظیم الشان خدمات کے صلے میں بادشاہ سلامت نے اعلیٰ ترین خطابات اور تمغوں سے نوازا ہے۔ یہ خطابات اتنے بڑے ہیں کہ ساری دنیا کے لوگ ہم پر رشک کرنے لگے ہیں۔ لیکن علی بابا یہ ہمارا حق تھا ہم ہی وہ تھے۔ جنہوں نے رات کی تاریکیوں میں نیند کی دیوی کو لات مار کر اندھیرے جنگلوں میں چھپ کر سانپوں اور بچھوؤں کا مقابلہ کیا اور سیسہ پلائی ہوئی دیواروں میں سیندھ لگائی۔ نئی نویلی دلہنوں اور کنواریوں کو اغوا کیا اور ان کے بوڑھے باپوں کو ننگا کر کے گاؤں کی گلیوں میں پھرایا۔ کیا یہ کام کوئی ایسا ویسا آدمی کر سکتا ہے؟''

علی بابا نے کپکپائی ٹانگوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''نہیں!''

''بالکل نہیں...... تو پھر یہ خطابات ہمیں نہ ملتے تو اور کیا بغداد کے نانبائیوں اور کنجڑوں کو ملتے؟ میری خدمات اور فتوحات سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔ ریاست کا بچہ بچہ' بوڑھا بوڑھا میری مردانگی' جرات' قلندری' اخلاص اور آہن صفت اولوالعزمی کا قائل ہے۔ میری تعریف وتوصیف بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ تم اتفاق سے اس وقت یہاں آ نکلے ہو گئے ہاتھوں میرے نائب وزراء کے وہ قابل صد ستائش کارہائے نمایاں بھی سنتے جاؤ جن کے عوض میں ہمارے بادشاہ نے ایک بہت بڑی شاہی تقریب میں انہیں خطابات اور تمغوں سے سرفراز فرمایا۔

علی بابا نے جلدی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

''ضرور ضرور۔ اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہوگی!''

اس پر ایک کرخت جبڑے اور ٹیڑھی ناک والے چور نے یوں کہا۔

''مجھے شاہ چنگڑ پور نے ''مکروہ الدہر'' کا اعلیٰ ترین خطاب عطا فرمایا ہے۔ میں ریاست کے بہت سے کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہوں جس میں یمن کی سرحدوں سے اغوا کی گئی لڑکیوں کی دیکھ بھال اور گندم' افیون اور چرس کی سمگلنگ نمایاں کام ہیں۔ میں محکمہ سمگلنگ اشیائے ممنوعہ کا سربراہ بھی ہوں۔ شروع شروع میں میں بڑا پرہیزگار اور پابند صوم وصلوٰۃ تھا۔ کسی سے دمڑی رشوت نہ لیتا تھا اور کسی کی خوشامد نہ کرتا تھا۔ چنانچہ گیارہ سال تک چونگی محرری اور بادشاہ کے اصطبل میں شام کو گھوڑوں کی مالش کرتا تھا۔ قلیل تنخواہ میں بمشکل گزر بسر ہو رہی تھی۔ مہینے کے آخری ہفتے گھر میں اکثر فاقہ ہوتا اور عملی طور پر صوم وصلوٰۃ کا ورد رہتا۔ آخر ایک دن کیا ہوا کہ بادشاہ سلامت بغرض شکار ہمارے علاقے میں تشریف لائے۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بادشاہ نے ساری عمر بندوق اٹھا کر نہیں دیکھی۔ چنانچہ میں نے کوئی دس گیارہ درجن بٹیریں پکڑ کر ان کو پر قینچ کیا اور جھولوں میں بھر کر کھیتوں میں لے آیا۔ بادشاہ سلامت جب مع اپنے عملے کے وہاں آئے تو میں پر کٹے بٹیروں کو لے کر کھیت میں ایک طرف چھپ گیا اور سگنل ملتے ہی مٹھی بھر بٹیروں کو ہوا میں چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے فوراً بندوق داغ دی اور پر کٹے بٹیر تڑپنے لگے۔ چنانچہ سارا دن میں بٹیریں بادشاہ کے آگے چھوڑتا رہا اور بادشاہ سلامت نشانہ لگاتے رہے اور شکار مارتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر مجھے محکمہ جنگلات کا افسر لگا دیا۔ اب میرا کام یہ تھا کہ ہر ہفتے محکمے کے وزیر کے ہاں بیٹروں کے ٹوکرے ایندھن سے لدے ہوئے چھکڑے' مرغیوں سے بھرے ہوئے ڈبے اور خالص شہد کے کٹورے اور مکھن پہنچاتا اور مہینے میں ایک بار جب بادشاہ سلامت گرمیاں گزارنے ہمارے ہاں تشریف لاتے تو ایک شہد ایسے گالوں والی پہاڑی لڑکی بھی مرغیوں کے ساتھ ہی پکڑ کر پاؤں دبانے کے لئے ان کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیتا۔ دوسرے سال میں نائب وزیر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اب میری قومی اور ملکی خدمات اور مصروفیات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا مگر ''کام'' بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ یعنی اب میں ہر دوسرے روز دورے پر ہوتا تھا اور لوگ اسی طرح میری ''خدمت'' کرتے تھے۔ جس طرح میں بادشاہ سلامت کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ریاست میں درخت لگانے کی مہم شروع ہوئی تو میں نے سارے شہر میں درختوں کا جنگل لگا دیا۔ یہ درختوں کی کٹی ہوئی ٹہنیاں تھیں۔ جنہیں ہم نے یونہی جگہ جگہ زمین پر گاڑ دیا تھا۔ جب درخت کاری کا ہفتہ ختم ہوا تو ہم نے سرکاری طور پر ہفتہ بکر منڈی منایا۔ ہم نے پہاڑ کے قومی الجثہ بکروں کو شہر میں چھوڑ دیا۔ بعد میں ان بکروں کو ایک سرکاری

تقریب میں محکمہ صفائی کی جانب سے ایک ایک شیونگ سیٹ عطا کیا گیا۔

پچھلے سال ہمارا ایک سرکاری وفد ماژندران گیا۔ یہ خاکسار اس وفد کا قائد تھا واپسی پر ہم نے دس اونٹ خریدے۔ پانچ اونٹوں پر افیون اور چرس لادی گئی۔ اونٹوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا گیا۔ اب یہ پہچاننا مشکل تھا کہ ثقافتی اونٹ کونسا تھا اور چرسی اونٹ کونسا۔ سرحد پر سپاہیوں نے سیلوٹ مار کر ہمیں سلام کیا اور کسی میں اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ ہمارے اونٹوں کو چیک کر سکتا۔ ریاست میں آ کر افیونی اور چرسی اونٹ بادشاہ سلامت کے محل کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ایک اونٹ مجھے مرحمت فرما دیا۔

یمن کی سرحد سے اغوا کی گئی خواتین کی حالت بڑی خراب تھی۔ بے چاریوں کے تن بدن پر کپڑا نہ تھا۔ میں نے نائب وزیر بنتے ہی اپنا قلمدان سنبھالا اور ان بے کس مہاجر خواتین کے کیمپ کی طرف چل پڑا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فوراً چھ خوب صورت کیم وشحیم آ ہو چشم لڑکیوں کو چھانٹا اور ان سے شادی کر لی۔ اگلے روز ان کی بہبودی کے لئے ایک ادارہ کھول دیا۔ جہاں انہیں مختلف کام سکھائے جاتے تھے۔ اب اس ادارے میں چار سو عورتیں کام کرتی ہیں اور ہم چالیس چوروں کے پاس فی کس دس عورتیں ہیں۔ چونکہ بادشاہ سلامت ان عورتوں کی فلاح وبہبود میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لئے یہ خاکسار گاہے گاہے ان عورتوں کو بیش قیمت دوشالے اوڑھا کر شاہی محل کی خواب گاہ میں بغرض اصلاح گیسو بھیجتا رہتا ہے۔ چنانچہ انہی خدمات کے معاوضے میں بادشاہ سلامت نے خوش ہو کر اس خاکسار کو بھرے دربار میں ''مکروہ الدہر'' کا دلنواز خطاب اور دو مربعے زمین عطا فرما کر عزت افزائی کی۔ کیا میں اس کا اہل نہ تھا۔؟''

سب چوروں نے بلند آواز میں کہا۔

''کیوں نہیں کیوں نہیں؟''

علی بابا نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ اب سردار نے ایک ایسے چور کی طرف اشارہ کیا۔ جو دوزانو ہو کر بیٹھا تھا اور سر جھکائے بڑے خضوع وخشوع سے تسبیح کا ورد کر رہا تھا۔ سردار کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اس چور نے اپنے سینے پر پھونک مار کر داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور یوں سلسلہ داستان شروع کیا۔

اس ہیچمدان کا نام بینگن ادرک پوری ہے اور شاہ چنگڑ پور نے خاکسار کو پری پیکر ملت کے لازوال خطاب سے نوازا ہے۔ بندہ کی خدمات کی فہرست اگرچہ طویل نہیں لیکن اہم ضرور ہے۔ وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میرا پہلا کارنامہ یہ تھا کہ میں نے بڑے جوڑ توڑ اور ریشہ دوانیوں کے بعد ریاست میں قحط ڈلوا دیا۔ وہ اس طرح کہ ریاست کی زرخیز ترین زمینوں پر ہمارے خاندان

والوں کا قبضہ ہے۔ میرے اشارے پر انہوں نے چاول کا ذخیرہ کرلیا اور مصنوعی قلت کا ماحول پیدا کردیا۔ مارکیٹ سے چاول غائب ہوگیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ہر طرف کال پڑ گیا۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی جانے لگیں۔ معبدوں میں رات رات بھر گھنٹیاں بجتی رہتیں۔ چاول سات روپے سیر تک بکنے لگا اور لوگوں کی بیٹیاں اور بہنیں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ حکومت نے اپنا ذخیرہ فوراً مارکیٹ میں پھینک دیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ چھاپے ڈالے گئے مگر ان سے بھی کیا ہوتا ہے۔ میں نائب وزیر تھا۔ چھاپہ وہیں ڈالا جاتا جہاں سے چاول کا سٹاک پہلے ہی سے کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا۔ جب چاول دس روپے سیر تک پہنچ گیا تو میں نے اپنے ذخیرے کو ہوا لگائی اور آٹھ روپے سیر کے حساب سے لاکھوں روپے کمائے۔ گوندل نگر میں دو محل بنوائے۔ ڈیڑھ سو اصلی نجدی اونٹ خریدے۔ والدہ ماجدہ کو حج کروایا۔ خود بھی حج کیا۔ مدینہ منورہ سے واپسی پر وہاں سے بیس سیر سونا بطور تبرک ساتھ لایا اور ریاست میں آکر انہیں عقیدت مند سمگلروں کے ہاتھ بیچ دیا۔

دوسرا کارنامہ اس خاکسار کا یہ ہے کہ بندہ نے ریاست میں اپنے چھوٹے بھائی کو استرے بنانے کا ایک کارخانہ لگا کر دیا۔ آہندران سے لوہا منگوانے کا اجازت نامہ لے کر دیا اور جب کارخانے میں استرے بننے شروع ہوگئے تو بادشاہ کو استروں کا ایک سیٹ پیش کیا۔ ان کی حجامت بنائی اور عرض کیا کہ اب اتنے اعلیٰ اور سستے استرے جب ریاست میں بننا شروع ہوگئے ہیں تو پھر آہندران، فاسفورس اور پولادگڑھ کے استروں کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ ان پر زرمبادلہ کیوں ضائع ہو۔ بادشاہ سلامت کو یہ بات بھا گئی۔ چنانچہ فوراً حکم صادر کردیا کہ باہر سے استروں کی درآمد بند کردی جائے اور آج سے ریاست میں صرف بینگن فیکٹری کے استرے ہی استعمال کئے جائیں۔ جب اس طرف سے معاملہ ٹھیک ہوگیا تو ہم استرے ایک دم ٹھنڈے کردیئے اور فولاد کی بجائے ٹین استعمال کرنا شروع کردیا۔ یہ بھی کوشش کی کہ ٹین کا بھی کوئی نعیم البدل مل جائے۔ اس سلسلے میں چیل کی لکڑی پر تجربہ کئے گئے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ہم نے استرے کی دھار پر دندانے ڈالنے شروع کردیئے۔ لوگوں نے چیخ پکار مچائی اور لہولہان ڈاڑھیاں لے کر بادشاہ سلامت کے پاس پہنچے اور بادشاہ نے اپنے چکنے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ مگر بھائیوں میری ڈاڑھی تو خوب بنتی ہے۔ ذرا سا بھی تنگ نہیں لگتا۔'' اب لوگوں کو کیا معلوم کہ بادشاہ کے لئے جو استرے تیار کئے جاتے تھے ان میں خالص فولاد استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اب تک ریاست کے باشندے صرف ہمارے ہمارے ہی خوفی استرے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے اب ہم نے یہ کیا ہے کہ استرے کی ہر چھوٹی پانچویں ڈبی میں راکھ بھر دیتے ہیں۔ تاکہ ڈاڑھی بنانے میں جو زخم آئیں وہاں وہ راکھ لگالیا کریں۔ بس میرے بھائی علی بابا! میری یہی وہ خدمات ہیں جن سے متاثر ہوکر بادشاہ سلامت نے مجھے ''پیکر ملت'' کا خطاب

عطا فرمایا اور ایک تمغہ بھی دیا جس پر ایک ہڈیوں کا پنجر آدمی استرے سے ڈاڑھی بنا رہا ہے۔''

اس کے بعد ''پیکر ملت'' نے آنکھیں بند کر لیں اور تسبیح پھیرنے لگا۔

اب چوروں کے سردار نے ایک ایسے آدمی کی طرف اشارہ کیا جو بڑا منحنی سا تھا اور جس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور جو کپڑے کے بہت سے تھانوں پر اکڑوں بیٹھا چرخہ کات رہا تھا۔ اسے ریاست کے بادشاہ کی طرف سے کفن چور کا خطاب ملا تھا۔ اس مرد کم گفتار نے سردار کا اشارہ پا کر چرخہ کا تنا بند کیا اور یوں گویا ہوا:

''بزرگوارم علی بابا! میرا نام بوسکی دو گھوڑے والا ہے۔ میں قصبہ جلہ ہونہ کا ایک معمولی جولاہا تھا۔ میرے ماموں اس علاقے کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انہوں نے اپنے مزارعین کا ایک سال کا لگان آدھا کر کے الیکشن لڑا اور کامیاب ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے وزیر بن گئے۔ یہ عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ میرے نام ایک کپڑے کی مل الاٹ کر دی اور سرکاری خزانے سے قرضہ بھی لے دیا اور باہر سے مشینیں منگوانے کا اجازت نامہ بھی دلوا دیا۔ پھر کیا تھا پل بھر میں کایا ہی پلٹ گئی۔ رات کو جولاہا بن کر سویا اور صبح اٹھا تو قریشی بن چکا تھا۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ لاکھوں کی خرد برد تھی۔ ریاست میں کپڑے کی پہلے ہی قلت تھی۔ میں نے دس آنے گز والا کپڑا تین روپے گز میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ٹیکس والوں کو جل دینے کے لئے بہی کھاتے الگ بنوا لئے۔ چار سو روپے ماہوار کا ملازم جب میرے ہاں چھاپہ مارنے آتا تو میں دو ہزار کے نوٹ سامنے رکھ دیتا ہمسایہ ملک میں لاکھوں تھان ہر روز سمگل کرواتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے لوگوں کی قوت خرید ماند پڑ گئی اور جسم ننگے ہو گئے اور پھر خاص طور پر کپڑے ایسا تیار کرواتا جو دوسری بار دھونے سے ہی تار تار ہو جاتا' سکڑ جاتا' غائب ہو جاتا۔ لوگوں کو کفن کے لئے لٹھا ملنا دشوار ہو گیا اور مردوں کو ٹاٹ میں یا پتوں میں لپیٹ کر دفن کیا جانے لگا۔ بادشاہ سلامت تک جب میری ان خدمات کی پوری پوری رپورٹ پہنچی تو انہوں نے خوش ہو کر مجھے شہر کے ایک خوبصورت ترین علاقے میں ایک سرسبز قطعہ اراضی عطا کر دیا۔ میں نے وہاں ایک ہیبت ناک محل بنوایا۔ جس میں بادشاہ سلامت اور امراء وزراء کی عیاشی اور محفل نشاط کی خاطر مرمریں ایوان تعمیر کروائے۔ اب دل نے کہا ہے کہ قوم کی کچھ اور بھی خدمات کرنی چاہیے۔ چنانچہ اپنے ماموں کی مدد سے شہر میں ایک درجن نئے شراب خانے کھلوانے کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ گاؤں میں شراب کشید کروانے کی بھٹیاں بنوائیں۔ شہر کے ایک مڈل سکول کو بند کروا کے وہاں ایک نئی مل چالو کروائی۔ فٹ پاتھوں کا فرش اکھڑوایا اور ایک ہسپتال کی عمارت کو گروا کر وہاں ایک عالی شان کلب بنوا دیا۔ اب بادشاہ سلامت مجبور ہو گئے کہ مجھے اپنے وزیروں میں شامل کر لیں چنانچہ مجھے خوراک اور صنعت و حرفت کے محکمے سونپے گئے۔ میں نے سب سے

پہلا کام یہ کیا کہ لوگوں پر روزی کا دروازہ بند کر دیا۔ خود گاؤں سے خراس کا تازہ دودھ ایسا آٹا منگواتا اور لوگوں کو بھوسہ' چری باجرہ مٹی ملا کر آٹا سپلائی کرتا۔ شہر کے تمام ڈپو رشتہ داروں میں بانٹ دیئے۔ گندم اور چینی کی بلیک بہ نفس نفیس خود کرتا۔ کیونکہ خدشہ تھا لوگ بلیک میں بے ایمانی سے کام لیں گے۔ ایمان داری سے سودا بیچنے اور خالص آٹا منڈیوں میں لا کر فروخت کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ میں نے تھوڑے ہی دنوں میں حسن کارکردگی سے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ہلدی میں چھال' مرچوں میں چونا' میدے میں دودھ پتھری چائے میں مینگنیاں اور گھی میں موبل آئل اور موم ڈال کر فروخت کریں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ پانی میں بھی کچھ نہ کچھ ملا دیا جائے مگر افسوس کہ اس نیک کام میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف اتنا ہی کر سکا کہ بعض جگہوں کے نل تڑوا دیئے تاکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم کہیں کہیں پانی میں خوبصورت ریت ہی مل جائے۔ سارے عوام میرے گرویدہ ہو گئے۔ میں جدھر سے گزرتا لوگ جھک جھک کر سلام کرتے۔ پھول برساتے۔ قصیدے پڑھتے۔ چنانچہ اس ہمہ گیر شہرت اور فقید المثال خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب دربار لگا تو بادشاہ سلامت نے مجھے ''کفن چور'' کے قابل فخر خطاب سے نوازا اور چالیس مربع زرخیز اراضی کی جاگیر عطا فرمائی۔ اب دل میں ایک ہی خواہش باقی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان قومی مصروفیات اے عہدہ برآ ہو کر حج کے لئے خانہ کعبہ کی راہ لوں اور باقی عمر یاد خدا میں بسر کر دوں۔ علی بابا! تم ڈاڑھی سے بزرگ آدمی نظر آتے ہو۔ دعا کرو تاکہ خدا میری یہ آرزو پوری کر دے۔''

اتنا کہہ کر بوکی دو گھوڑے والا ''کفن چور'' خاموش ہو گیا اور بڑے انہماک سے چرخہ کاتنے میں مشغول ہو گیا۔

اب چوروں کے سردار نے ایک ایسے چور کی طرف انگلی اٹھائی جو شکل سے اٹھائی گیرا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ صاحب بادشاہ سلامت کے درباری شاعر تھے اور انہیں بادشاہ سلامت نے ''مسکا جی حضوری'' کے بلند مرتبت خطاب سے نوازا تھا۔ آپ مشت استخواں تھے اور شاہ چنگڑ پور کی مدح میں نغمہ خواں تھے۔ آپ نے اذن سردار پا کر مٹھی ہوا میں اٹھائی۔ کچھ دیر خلا میں قیام کیا۔ پھر اسے گھما کر اپنی ران پر مارا اور ترنم سے فرمایا۔

''اے حضور! عرض کیا ہے کہ یہ بندہ کمینہ اگرچہ ہمسایہ خدا نہیں پر کسی سے کم بھی نہیں۔ اے واللہ ہم سے کسی کی خوشامد نہیں ہوتی۔ ہم سخن فہم ہیں۔ غالب کے طرف دار نہیں اور اگر طرفداری کرتے بھی ہیں تو سخن فہمی کی بنیاد پر ہم سے یونہی کسی کی بے جا ناز برداری نہیں ہوتی۔ خدا سلامت رکھے میرے بزرگ علی بابا کو۔ ہم شاعر ہیں اور بدنام نہ ہونے کے باوجود اچھے شاعر ہیں۔ بڑے پائے کے شاعر ہیں۔ چوپائے کے شاعر ہیں۔ ہمیں صرف بے باکی' صاف گوئی' تبحر علمی' جدت طبع اور کھری کھری بات کہہ جانے کے

صلے میں یہ خطاب ملا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ہوا یوں کہ ایک دن بادشاہ سلامت نے بڑی موج میں آ کر ہمیں ایک شعر سنایا اور پوچھا کہ میاں بتاؤ تو بھلا یہ شعر کس کا ہے! شعر یہ تھا۔

غالب تمہی کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

میں تو حصنت سوچ میں پڑ گیا۔ ایک الو کا پٹھا بولا۔ حضور یہ تو آپ کا شعر معلوم ہوتا ہے۔ بدبخت نے خوشامد سے کام لیا تھا۔ لیکن یہ بندہ علم کے معاملے میں کسی کو سامنے نہیں لاتا۔ بادشاہ کیا اگر اس کا باپ بھی ہوتا تو ہم کبھی نہ کہتے کہ یہ شعر اس کا ہے۔ صاحب میں تو ٹک ٹک بادشاہ سلامت کا منہ تکنے لگا۔ حیران و پریشان کہ یہ شعر کس کا ہو سکتا ہے۔ آخر نہ رہا گیا۔ بادشاہ سے عرض کی۔

''حضور انور! بندہ اپنی کم مائیگی علم کا معترف ہے۔ خاکسار کا مطالعہ اس قدر کہاں کہ حضور کے منہ آ سکے۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شعر کسی غضب کے شاعر کا ہے۔''

بادشاہ نے خندہ لب سے کام لیا۔ مسکرائے' سر ہلایا جھومے اور فرمایا۔

''پھر سوچو سوچو یہ شعر کس کا ہے۔''

غالب تمہی کہو کہ۔۔۔۔۔۔

میں نے جب اپنی شکست کا اعتراف کیا تو بادشاہ نے مسکرا کر فرمایا۔

''یہ شعر مرزا غالب کا ہے۔''

حصنت میرے منہ سے تو چیخ ہی نکل گئی۔ حیران رہ گیا۔ اپنی بے بضاعتی اور شاہ چنگڑ پور کی استعداد علمی اور وسعت مطالعہ پر عرض کیا۔ حضور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کے علمی اور فلسفیانہ نکات آپ ہی حل کر سکتے ہیں کسی اور کو دم مارنے کا یارا نہیں۔ پس میرے علی بابا صاحب! دوسرے ہی دن بادشاہ نے بھرے دربار میں مجھے ''مسکا جی حضوری'' کے خطاب لازوال سے آراستہ فرمایا اور ایک پر مغز تقریر میں درباریوں امرا اور وزراء کو تلقین فرمائی کہ وہ اپنے اندر میرے ایسی بے باکی طاف گوئی اور کلمہ حق کہہ ڈالنے کی صلاحیت پیدا کریں۔''

علی بابا کا سر وجد میں آ کر جھومنے لگا اور وہ حضرت ''مسکا جی حضوری'' کے کارنامے پر عشق عشق کر اٹھا۔

سب سے آخر میں ایک ایسے مسکین صورت گنجے سے آدمی کو لایا گیا۔ جس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے اور

جس کے سر پر ایک چور برابر جوتے لگا رہا تھا اور اسے دھکے دیئے جا رہا تھا۔ سردار نے نفرت سے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ اس چغد کو ''حقدار وطنی'' کا خطاب کیوں دیا گیا۔ شاید بادشاہ کی عقل ماری گئی تھی اور وہ خطاب دیتے ہوئے تھک گئے تھے۔'' علی بابا نے پوچھا کہ ''ان حضرت کی خدمات کیا ہیں؟'' سردار بولا۔ ''خدمات کیا خاک ہوں گی' ذرا ان کی شکل تو دیکھو۔'' اور سردار نے شراب کا بھرا ہوا جگ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ مسکین صورت آدمی چلانے لگا۔ ''خدا کے لئے مجھے اس شہر سے باہر جلا وطن کردو' میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔'' علی بابا کے بار بار پوچھنے پر سردار نے کہا۔

''سنا ہے اس کم بخت نے حساب کتاب کا کوئی نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ اربوں کی گنتی منہ زبانی کرلیتا ہے۔ چاند تاروں کا حساب لگالیتا ہے۔ کہتا ہے تارے کے اندر بھی تارے ہوتے ہیں اور ہر چیز گھومتی رہتی ہے۔ بھلا اس گدھے سے پوچھو میرا سر کیوں نہیں ہل رہا؟ پورا بنیا ہے بنیا۔ لاکھوں کی رقم کو منٹوں میں تقسیم کرکے رکھ دیتا ہے۔ ضرب سے تفریق کرتا ہے اور جمع سے تقسیم کرتا ہے۔ کاغذ پر ایسے ایسے ہندسے لکھتا ہے کہ بھلے چنگے آدمی کا سر چکرا جاتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے جس کے عوض اسے ''حقدار جلا وطنی'' کا خطاب دیا جاتا۔ اگلی بار جب دربار لگے گا تو ہم بادشاہ سلامت سے سفارش کریں گے کہ اس گدھے سے اس کا خطاب چھین لیا جائے۔ اگر ایسے ویسے اٹھائی گیروں کو خطاب ملنے لگے تو ہم لوگ کہاں جائیں گے۔ ہماری کیا خاک عزت باقی رہے گی۔ پھر ہمارے کارناموں اور ہماری خدمات کو کون پوچھے گا۔ بینگن اور کپوری صاحب اتنی دیر تک آپ اس چغد کو ملک بدر کردیں اور اس کا انتظام کریں کہ یہ ہماری ریاست چنگڑ پور میں واپس آنے کی کبھی جرات نہ کرے۔''

اس پر مسکین صورت آدمی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ بے اختیار پکار اٹھا:۔ میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔''

''چپ رہ ناہنجار'' بوسکی دو گھوڑے والا صاحب! آپ فوراً اپنے سارے بہی کھاتے اور حساب کی پوتھیاں اس کے آگے لاکر ڈھیر کر دیں تاکہ جلاوطن ہونے سے پہلے پہلے اس سے حساب کا سارا کام لے لیا جائے اور ہمارے اکاؤنٹ اپ ٹو ڈیٹ ہو جائیں۔''

اس کے بعد سردار نے علی بابا کی ٹانگوں کا جو ابھی تک کپکپا رہی تھیں۔ جام صحت تجویز کیا اور شراب پی کر جام زمین پر پھینک دیا۔ اب سب چور نشے میں جھوم کر اٹھے اور غار میں انہوں نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر جانوروں کی طرح ناچنا اور ہلڑ مچانا شروع کر دیا۔ علی بابا نے موقع غنیمت جانا۔ فوراً اپنی پگڑی سنبھالی' گدھے کو ساتھ لیا اور دبے پاؤں غار سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے گدھے پر سوار ہو کر اسے ایڑ دکھائی اور چشم زدن میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

◆◆◆

یتیم ہائی سکول رجسٹرڈ

الٰہی جان کالونی داخل ہونے کے لئے آپ کو گندے نالے کا پل عبور کرنا پڑتا ہے یہ پل عبور کرنے کے لئے آپ کو پانی سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پل نالے کے اندر واقع ہے اور پانی اس کے اوپر سے گزر رہا ہوتا ہے۔ کارپوریشن والوں نے یہاں ''پتلون اٹھا کر چلیں'' کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ یتیم ہائی سکول اس پل کی بائیں جانب ایک جوہڑ کے کنارے پر ہے۔ اس جوہڑ میں کالی بھینسیں مزے سے بیٹھی جگالی کیا کرتی ہیں اور اپنے سروں پر بیٹھے کوؤں کو اڑایا کرتی ہیں۔ سکول میں بھی کچھ استانیاں اسی طرح اپنے اپنے کمرے میں بچوں اور بچیوں کے سامنے بیٹھی جگالی کیا کرتی ہیں اور ناک پر بیٹھنے والی مکھیوں کو اڑایا کرتی ہیں۔ لیکن اس سکول کی ہیڈ مسٹریس نے اپنی ناک پر کبھی مکھی نہیں بیٹھنے دی بلکہ وہ خود بھی کہیں کم ہی بیٹھتی ہے۔ اسے بچے بچیوں کی صحت کا اس قدر خیال ہے کہ صبح صبح خود ٹوکرا اٹھا کر میوہ منڈی میں تازہ پھل خریدنے جاتی ہے اور اسے بچوں میں تگنے منافع پر فروخت کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے آدھی چھٹی کے وقت سکول کا دروازہ لاہور کے اکثر سینماؤں کی طرح بند کر دیا جاتا ہے تاکہ بچے باہر جا کر اچھی اچھی سستی چیزیں نہ خرید سکیں۔

لیکن سب سے پہلے میں آپ کو یتیم ہائی سکول کے بانی اور منیجر صاحب سے ملواتا ہوں۔ آپ سے ملئے۔ آپ ہیں الحاج خواجہ بدھ میاں عرف بھولے پیا۔ آپ بڑے مرنجا مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ملک وملت کی خدمت کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اسی جذبے کے تحت آپ نے الٰہی جان کالونی میں بچے بچیوں کا ایک سکول کھول رکھا ہے اور اب اپنی تجوری کو نوٹوں سے کوٹ کوٹ کر بھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شروع شروع میں ایک لکھنوی کی دکان پر ورق کوٹنے کا کام کیا کرتے تھے۔ بعد میں جب پاکستان بنا تو آپ نے افیون کی سمگلنگ کا دھندا شروع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک بار پکڑ لئے گئے اور سارا مال بحق سرکار ضبط ہو گیا اور آپ قید ہوتے ہوتے بچے۔ اس کے بعد آپ نے کتابوں وغیرہ کی جلد سازی کا کام شروع کر دیا اور یہاں سے ترقی کرتے کرتے ایک بوسیدہ جلے ہوئے مکان کو اپنے نام الاٹ کروایا اور یتیم ہائی سکول کے نام سے ایک سکول جاری کر دیا۔ پہلے پہل اسکول کی گھنٹی بجانے سے بچوں کو ورق کوٹنے سمگلنگ اور جلد سازی کے بارے میں لیکچر دینے تک سارا کام خود

ہی سرانجام دیتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اسکول نے ترقی کی تو آپ نے ایک ہیڈ مسٹریس اور چند استانیاں ملازم رکھ لیں اور خود منیجر بن بیٹھے۔ اب اس اسکول میں دو تین سو کے قریب بچے بچیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال ایک سالانہ جلسہ ہوتا ہے جس میں کسی بڑے عہدیدار کو بلا کر اس کی شان میں قصیدہ خوانی ہوتی ہے اور حکومت سے گرانٹ میں اضافہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بھولے پیا نے سکول کی عمارت کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔ صرف دروازے اور کھڑکیاں نئی بنوالی ہیں۔ گلبرگ میں اس کی اپنی دو کوٹھیاں ہیں اور تیسری زیر تعمیر ہے۔ استانیوں کی تنخواہیں پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں۔ مگر ہیڈ مسٹریس کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار ہے۔ یہ اس لئے کو بھولے پیا کی اس سے منگنی ہو چکی ہے۔

بھولے پیا حال ہی میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر لوٹے ہیں۔ اس ساعت نیک کی ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے آپ نے ڈاڑھی بڑھالی ہے اور پانچوں وقت کی نماز بھی شروع کر دی ہے۔ لیکن آپ ان بزرگوں میں سے نہیں ہیں جو دولت کے نشے میں اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ آپ کو اپنے فرائض کا شدید احساس ہے۔ آپ اسکول کی ترقی و ترویج کے لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ دن میں ایک بار سکول کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ ہر کمرے میں جا کر استانیوں کے کام میں مداخلت کرتے ہیں۔ اور بچوں کے کان مروڑتے ہیں۔ آپ نے ہر کمرے میں دیواروں پر اس قسم کے موٹو لکھوا رکھے ہیں۔ جو بھولے پیا کی پرانی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلا

سمگل کیا ہوا علم کوئی نہیں چھین سکتا۔

جلد سازی جعل سازی سے بہتر ہے۔

علم چاندی کا ورق ہے۔

آپ کی طبیعت ابھی تک غریبانہ ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ٹرک خرید سکتے ہیں۔ مگر آپ نے اپنا پرانا تانگہ نہیں چھوڑا۔ اسی تانگے میں کبھی وہ بھاٹی سے موچی اور موچی سے بھاٹی سواریاں لے لے جایا کرتے تھے۔ اور آج بھی وہ اسی میں سوار ہو کر منڈی میں گھوڑے کے لئے دانا خریدنا باعث عیب نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہاں تک کہ گھوڑے کا دانہ خریدنے سے پہلے اسے خود کھا کر دیکھتے ہیں کہ کہیں خراب تو نہیں سبحان اللہ' ایسے لوگ پھر کہاں ملیں گے؟

ہیڈ مسٹریس صاحبہ بھی اپنے ہونے والے شوہر سے کم محنتی اور سادہ مزاج نہیں ہیں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آپ بہ نفیس نفس منڈی سے پھل خرید کر لاتی ہیں اور انہیں سکول کا دروازہ بند کر کے بچوں میں تگنی قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ

بچوں کے پاس اتنے پیسے ہی نہ رہیں کہ وہ باہر سے تازہ اور اچھی اچھی چیزیں خرید سکیں۔ اس کے علاوہ ہر روز بچوں سے دو آنے بطور چندہ لئے جاتے ہیں تاکہ انہیں کفایت شعاری کی عادت پڑے اور ان کے دلوں میں جانوروں کے لئے رحم اور قربانی کا جذبہ پیدا ہو۔ کیونکہ بعد میں گھوڑے کے لئے پٹھے اسی اسی چندے سے خریدے جاتے ہیں۔ بچوں کے ذہنوں میں سے شخصیت پرستی کا ناجائز احساس مٹانے کے لئے ہیڈ مسٹریس صاحبہ ہر امتحان کے موقع پر کامیاب طلبا کو مشورہ دیتی ہیں کہ وہ استانیوں کے گلوں میں ہار نہ ڈالیں بلکہ سکول کے لئے کوئی تحفہ خرید لیا کریں۔ بچوں کو آج کل بے معنی ورزش اور واہیات تفریح سے حتی الوسیع دور رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکول میں نہ کوئی کھیل کا سامان ہے نہ کھیل کا پلاٹ ہے۔ بچوں کو جسمانی طور پر چاق و چوبند رکھنے کے لئے انہیں ہر دوسرے تیسرے دن جھاڑو دے کر تمام کمروں کی صفائی کروائی جاتی ہے۔ جو لڑکے یا لڑکیاں لمبی ہیں۔ انہیں میزوں پر کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ آسانی سے چھت کا جالا صاف کر سکیں۔

بچوں کے لئے صفائی کا معقول انتظام ہے۔ اسکول کی پشت پر جو گندہ جوہڑ ہے اسکول اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ بچے وہاں جا کر تختیاں دھوتے ہیں۔ نہاتے ہیں بھولے پیا خود جوہڑ میں اتر کر بچوں کو تیرنا اور بھینس کی طرح پانی میں بیٹھ کر جگالی کرنا سکھلاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے کے فن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور بعد ازاں انہیں جتلایا جاتا ہے کہ مچھلیوں کو بیچ کر ان کے پیسوں سے کس طرح تجوری کا ایک خانہ بھرا جاتا ہے۔ بھولے پیا کبھی کسی بچے یا بچی کی فیس معاف نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح بچے کے دل میں شدید قسم کا احساس کمتری بیدار ہو جاتا ہے جو اس کی پوری شخصیت کو پارا پارا کر دیتا ہے۔ چنانچہ بچوں میں احساس برتری پیدا کرنے کے لئے آپ نہ صرف یہ کہ ان سے دگنی فیس وصول کرتے ہیں بلکہ ہر ماہ ایک روپیہ چندہ بھی لیتے ہیں۔ اس چندے سے مائع خریدی جاتی ہے جو پکا کر بچوں کی گردنوں پر مل دی جاتی ہے تاکہ وہ ہمیشہ اکڑی رہیں۔

ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا وہ خود بھی اس کمرے میں ڈر ڈر کر جاتی ہیں۔ بھولے پیا کے سوا اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ انہیں بھی جب اندر جانا ہو تو ایک ہاتھ داڑھی پر اور دوسرا کان پر رکھ کر یہ مصرعہ بار بار گانا پڑتا ہے۔

نصیب در پہ تیرے آزمانے آیا ہوں

سالانہ جلسے کے موقع پر کرسیاں اور میزیں وغیرہ محلے کے گھروں سے مانگی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس روز سکول کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے۔ اس روز آس پاس کے تقریباً ہر گھر میں چاء زمین پر بیٹھ کر پی جاتی ہے۔ بھولے پیا اس دن بڑی بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ ایسے

موقع پر وہ برسر اقتدار پارٹی کے لیڈر کو ہی بلاتے ہیں اور پھولوں کے ہار ڈال کر ان کی تعریف میں اچھل اچھل کر قصیدہ پڑھتے ہیں اور کبھی کبھی شدت جذبات میں آ کر رو بھی پڑتے ہیں۔ بھولے پیا نے دل بکری کا پایا ہے اور کچھ کچھ شکل بھی۔ لاؤڈ سپیکر پر تازہ بتازہ فلمی ریکارڈ بجاتے ہیں۔ بلکہ دوپہر کو محلے والوں کی فرمائش بھی براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔ مخیر حضرات و خواتین سے عطیہ وصول کرتے ہیں۔ سٹیج پر بچوں کی طرف اشارہ کر کے چیخ چیخ کر، رو رو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر گردن مٹکا مٹکا، ٹانگ اٹھا اٹھا کر بیا نگ دہل اعلان کرتے ہیں۔

''حضرات .... یہ بچے آپ کے بچے نہیں ہیں۔ میرے بچے ہیں۔ قوم کے بچے ہیں۔ پاکستان کے بچے ہیں۔ آہ! حضرت اقبال بھی کیا حسب حال فرما گئے ہیں۔ یہاں بھولے پیا کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ جگر کا خون دے دے کر یہ بچے میں نے پالے ہیں۔ خدا غریق رحمت کرے۔ ایک بار میں علامہ صاحب سے ملنے گیا تو آپ حقہ پی رہے تھے مجھے دیکھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ بولے بھولے پیا! ظالم اتنی دیر تو جدا نہ رہا کرو۔ تمہاری الو کے پٹھوں ایسی باتیں سننے کو جی قابو سے باہر ہو رہا تھا۔''

اسی طرح بھولے پیا تقریر کے جوش میں کئی بار موضوع بھولتے ہیں، آپے سے باہر ہوتے ہی باہر سے پھر آپے میں آتے ہیں اور جلسہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ سکول کو بچوں کے پانی پلانے والے ایک نئے جوہڑ کی تعمیر کے لئے چندے کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

پچھلے برس یتیم ہائی سکول کے سالانہ جلسہ میں چھٹی اور ساتویں جماعت کی دو طالبات کو صوبے بھر میں اول آنے پر سونے کے دو میڈل بطور انعام دیئے گئے۔ بھولے پیا نے ان طالبات کو اور اپنے آپ کو پھولوں کے ہاروں سے لاد ڈالا۔ ان میں سے ایک لڑکی جو کہ اردو میں اول آئی تھی اس کا حل شدہ پرچہ معزز مہمانوں کو باری باری دکھایا گیا۔ پرچہ جس نے بھی دیکھا وہ یتیم ہائی سکول کے اعلیٰ تعلیمی معیار اور لڑکی کی قابلیت پر عش عش کر اٹھا۔ نمونے کے طور پر آپ بھی پرچے کی ایک جھلک دیکھئے۔ سوال تھا کہ ''شب خون مارنا'' اینٹ سے اینٹ بجانا' قافیہ تنگ کرنا' ڈور ڈھیلی چھوڑنا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کرنا کو مختلف فقروں میں استعمال کرو۔ اب فقرے ملاحظہ ہوں۔

شب خون مارنا

1- مصطفیٰ کمال نے اپنی قوم کو اچھا بنانے کے لئے شب خون مار کر کام کیا۔

2- اکبر نے اتنا شب خون مارا کہ اپنے بھائی کا سر قلم کر دیا۔

3- ماں ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ شب خون مارتی ہے۔

4- راشدہ شب خون مار کر امتحان میں کامیاب ہو گئی۔

5- کسی کو زیادہ شب خون نہیں مارنا چاہیے۔

6- انگریزوں نے مصر پر دن کے وقت بھی شب خون مارا۔

پانی کا پانی اور.......

1- پانی میں دودھ ڈالو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

2- پانی کو جتنا ہلاؤ وہ اسی طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی رہے گا۔

سبحان اللہ! سبحان اللہ۔

اب ذرا دوسری طالبہ کے پرچے کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ اس لڑکی نے تاریخ جغرافیہ میں اول انعام حاصل کیا۔

1- سورج کی شعاعیں سمندر پر پڑتی ہیں تو پانی ''باپ'' بن کر اوپر اڑ جاتا ہے۔

2- جب دو سمندر آپس میں ٹکراتے ہیں تو چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

3- سدا بہار جنگلوں میں چیر پھاڑ کے درخت بھی شامل ہیں۔

4- نانا فرنویس گھانس پھوس کھا کر گزارہ کرتا تھا۔

5- اورنگ زیب لٹکا لٹکا کر کے خرچ کرتا تھا اور ٹاکیاں لگاتا تھا۔ سبحان اللہ' سبحان اللہ!

مسٹر گھڑیال اور فلمی کہانی

پروڈیوسر ڈائریکٹر مسٹر گھڑیال کی فلم لاتوں کے بھوت باوجود ہزار کوششوں کے بری طرح ناکام ہوگئی۔ کرائے کے آدمیوں نے ہر سین پر نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ ہر ڈائیلاگ پر فلک شگاف تالیاں پیٹیں۔ گامی پہلوان کے پٹھوؤں نے فلم کے دو سینوں پر تنقید کرنے والوں پر ڈنڈے برسائے۔ انہیں مردہ چوہوں کی طرح اٹھا کر سینما ہال کے باہر پھینکا۔ مسٹر گھڑیال کے خوشامدی چمچوں نے ہر شو پر اپنے پروڈیوسر ڈائریکٹر کو 21 گولوں کی سلامی دی۔ مگر فلم دوسرے ہفتے ہی گول ہوگئی۔ کیونکہ اب کرائے کے آدمیوں نے بھی سینما ہال میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں یہ اعتراض تھا کہ انہیں فلم دیکھتے ہوئے دردسر استفراغ ہیجان خون اور استقرآ لورید کے دورے پڑتے ہیں۔ مسٹر گھڑیال نے انہیں سینما ہال میں اسپرو' تخم ستیاناسی سپستان صندلیں' عرق جالینوس اور خمیرہ مروارید عنبری کی وافر سپلائی کا بندوبست کیا مگر یونانی اور مغربی دوائیوں کی یہ کھیپ بھی فلم کی بوریت کو کم نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ کرایہ کے آدمیوں میں سے اکثر فلم دیکھتے ہوئے بے ہوش ہونے لگے۔ مسٹر گھڑیال کو ریڈ کراس والوں سے مل کر ایمبولنس کا انتظام کرنا پڑا جس کے تین چار اسٹریچر ہر بیس منٹ بعد فلم بین حضرات کو چالو شو میں سے اٹھا کر ہسپتال پہنچانے لگے۔ آخر یہ معاملہ پولیس کے نوٹس میں لایا گیا اور فلم لاتوں کے بھوت دوسرے ہفتے میں ہی اتار دی گئی اور اس کے ڈبے مسٹر گھڑیال کے دفتر میں لا کر اس کونے میں ڈھیر کر دیئے گئے' جہاں اس کے سٹاف کے اراکین تمباکو والے پان چبانے کے بعد پچکاریاں مارا کرتے تھے۔

مسٹر گھڑیال کو اس ناکامی کا بڑا صدمہ ہوا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگرچہ ہدایت کاری کی ذمہ داری اس کے شاگرد رشید مسٹر بھوندو پر تھی۔ تاہم فلم اس کے اپنے یونٹ کی تھی اور اب سرمایہ دار اسے اگلی فلم کے لئے روپیہ دیتے گھبرائیں گے۔ دفتر میں آتے ہی مسٹر گھڑیال اپنے شاگرد ڈائریکٹر مسٹر بھوندو پر برسنے لگے۔

حرامزادے! تو نے میرا بیڑا غرق کرا دیا ہے۔ برسوں کی محنت سے جو ساکھ بنائی تھی اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اسے مٹی میں ملا دیا ہے میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ بھائی دروازے میں بیٹھ کر چھولے بیچنے والے فلمیں کیا بنائیں گے۔ تمہیں تو کہیں جا کر کلیجے لگانے کا کام کرنا چاہیے۔ لعنت ہے۔"

حالانکہ فلم کے رش دیکھ کر مسٹر گھڑیال نے اپنے شاگرد مسٹر بھوندو کی پیٹھ ٹھونکی تھی اور کہا تھا:

مجھے تم پر فخر ہے۔ بھوندو تم پاکستان کے نمبرون ڈائریکٹر بن گئے ہو۔ تمہاری پہلی ہی فلم ''لاتوں کے بوت'' ایوارڈ لے گی۔ گولڈن جوبلی تو اس کا باپ بھی کرے گا۔ میں آئندہ اپنی چار فلمیں تمہیں دوں گا۔ یہ لو پندرہ روپے تمہارے' تمہارا انعام ان کی بسنت پر ڈور لگوا لینا۔''

مگر فلم کے فیل ہو جانے پر مسٹر گھڑیال نے مسٹر بھوندو کے سر پر جوتا مارتے ہوئے کہا۔

آجاتے ہیں ڈائریکٹر بننے....... ان پڑھ جاہل....... سوٹ تین سو کا پہنتے ہیں مگدر تین من کا اٹھا لیتے ہیں اور انگریزی کا ایک لفظ نہیں اٹھا سکتے۔ سالے تمہیں تو کہیں جا کر چھابڑی لگانی چاہیے۔ بس آج سے تم سب کو چھٹی۔ میں سارے نئے آدمی بھرتی کروں گا اور کوئی بی اے سے کم نہیں ہوگا۔ منشی جی تم بھی اپنا بوریا بستر باندھو' کہانی لکھی تھی یا سٹے کی پرچی لکھی تھی؟ کرین پلے بنایا تھا۔ کہانی نئی بنائی تھی؟ لوہار کہیں کا دفع ہو جاؤ ننگا ہوں سے۔

منشی جی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کانپ گئے۔ بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہوئی۔ نعرہ بلند کیا' دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر مارے اور اٹھ کر میدے کی بوری کی طرح اپنے آپ کو مسٹر گھڑیال کے قدموں پر گرا دیا۔

''حضور رحم! حضور کرم! میرے بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ میں آپ کا در چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ حضور میری گردن میرے موٹے جسم سے الگ کر دیجئے۔ مگر مجھے اپنے یونٹ سے الگ نہ کیجئے۔''

منشی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ مسٹر گل قند گیت نویس بھی چیخ مار کر مسٹر گھڑیال کے قدموں پر گر پڑے کیمرہ مین نے اپنی ٹوپی اتار کر مسٹر گھڑیال کے پاؤں پر دے ماری اور بال کھول کر بال کھیلنے لگا۔ میوزک ڈائریکٹر نے دیوار سے ٹکر مار کر ماتھا لہولہان کر لیا اور اپنے ڈائریکٹر کے اردگرد لوٹن کبوتر کی مانند چکر کاٹنے لگا۔ پروڈکشن انچارج نے فوراً صف ماتم بچھائی۔ اپلے سلگائے اور سبھوں نے سروں پر رومال باندھ کر مرحوم فلم کے حق میں دعائے مغفرت کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر اگلی فلم کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ چنانچہ اسی منصوبہ بندی کے تحت مسٹر گھڑیال نے کراچی کے دو عدد سیٹھوں کو پھانس لیا۔ یہ دونوں سیٹھ بالکل اس طرح پھنسے جس طرح چوہا چوہے دان میں پھنستا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مسٹر گھڑیال نے چوہے دان میں روٹی کے ٹکڑے کے بجائے ایک موٹی تازی نیم عریاں لڑکی کو لٹکا دیا تھا۔ مسٹر گھڑیال اس مقصد کے لئے اپنے پروڈکشن انچارج یا اپنے سیکرٹری کے ہمراہ بہ نفس نفیس خود کراچی تشریف لے گئے۔ میٹروپول ہوٹل میں جا کر کمرہ لیا اور تمام فلمی اخباروں میں یہ خبر شائع کرا دی کہ مشہور ڈائریکٹر مسٹر گھڑیال اپنی نئی

فلم کے لئے نئے چہروں کی تلاش میں کراچی تشریف لائے ہیں اور میٹروپول ہوٹل کے کمرہ نمبر چار سو بیس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ فلم ٹیکنی کلر ہوگی اور اس پر تیس لاکھ روپے کے قریب خرچ آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو میٹروپول ہوٹل کے کمرہ نمبر 420 میں فیشن پرست بے وقوفوں کی نیم پڑھی لکھی فلم کی شوقین لڑکیوں کا تانتا بندھ گیا۔ فون پر فون آنے لگے اور دوسری طرف کراچی کے وہ سیٹھ چوکنے ہوگئے جنہوں نے اپنے دوسرے کاروبار میں سے سرمائے کا کچھ حصہ انکم ٹیکس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے فلم پروڈکشن کی خاطر رکھ چھوڑا ہوتا ہے۔ مسٹر گھڑیال نے ہوٹل میں بیٹھ کر نئی فلم کی شوقین اونچی لڑکیوں سے انٹرویو لینے شروع کر دیئے ادھر سیکرٹری صاحب نے دو عدد موٹے بھدے سانڈ ایسے سیٹھوں سے بات طے کر لی اور انہیں ہوٹل میں مسٹر گھڑیال سے ملاقات کا وقت دے دیا۔ ادھر مسٹر گھڑیال نے بہت سی لڑکیوں میں سے ایک ایسی لڑکی کو منتخب کر لیا جو جوانی اور فلمی نشے میں چور تھی اور اسی نشے کے نتیجے میں اس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

وقت کے عین مطابق پلپلے بے وقوف بوجھل پپوٹوں والے سیٹھ ایک دوسرے کے اوپر گرتے ہوٹل کے کمرے نمبر 420 میں داخل ہوئے۔ مسٹر گھڑیال اور سیکرٹری نے ان کا خیر مقدم کیا اور ایٹم جان سے تعارف کرایا۔ دونوں سیٹھوں نے مس ایٹم جان کو دیکھ کر باری باری زوردار ڈکاریں لیں اور گردنوں کو یوں جھٹکے دیئے جیسے کوئی لدران کے سروں پر چڑھ بیٹھا ہو۔ مسٹر گھڑیال نے چوہے دان کا پنجرہ کھول کر اندر ایٹم جان کر ٹکڑا لٹکا دیا تھا اور سیٹھوں کے چوہے اسے للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کھٹک کی آواز آئی۔

اور چوہے دان کا دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ مسٹر گھڑیال اور سیکرٹری صاحب نے فتح مندی سے چوہے دان کو دیکھا اندر دو موٹے سیٹھ پھدک پھدک کر ایٹم جان کے ٹکڑے سے کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چنانچہ طے یہ ہوگیا کہ سیٹھ صاحب خود لاہور آ کر فلم کی کہانی سنیں گے اور پھر پورے کا پورا ڈانس کریں گے۔

لہٰذا آج مسٹر گھڑیال کے دفتر میں کراچی کے موٹے چوہے...... معاف کیجئے گا۔ موٹے سیٹھ کہانی سننے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ دفتر کا ایک کمرہ خاص طور پر صاف کر کے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر اللہ رسول کے قطعے لٹکا دیئے گئے۔ اگربتیاں سلگائی گئیں۔ کونوں کھدروں میں ہرمل کی دھونی دی گئی۔ کاغذ کے پھولوں کے گلدستے لا کر کارنس پر رکھے تھے۔ مسٹر گھڑیال نے خوب بنا سنوار کر شیو کیا۔ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا۔ اس دفعہ پھر انہوں نے ایک زبردست حملے کی تیاری کر رکھی تھی یعنی ہیرا منڈی کی نمبر وان طوائف ایکٹریس پھلجھڑی بائی کو بلا لیا تھا تاکہ کہانی سنانے کے دوران وہ بھی کمرے میں موجود رہے۔ پھلجھڑی بائی کا بھائی جو

اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کپڑے پہنتا تھا مسٹر گھڑیال کا خاص آدمی تھا۔ وہ اپنی بہن کو مسٹر گھڑیال کے کمرے میں ریہرسل کے لئے اکیلا چھوڑ کر باہر بیٹھ کر 575 کے سگریٹ پیا کرتا اور اپنی لیمپ کے سگریٹ سے بھی سستی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہتا۔

پھلتری بائی کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس نے نائلن کی پھولدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس میں سے اس کے کالے پیٹ کا ایک بدنما بل اور کہنیوں پر کے سیاہ بال صاف نظر آ رہے۔ پھلتری بائی عین وقت پر آ کر دفتر کے کمرے میں مسٹر گھڑیال کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ مسٹر گھڑیال کے منہ میں پان تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا' کونے میں پچکاری چلائی' سر کھجایا اور سگریٹ جلا کر کہانی کے مسودے کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھلتری بائی اس دوران میں پہلے تو دانتوں سے ناخن کترتی رہی پھر پرس میں سے وینٹی کیس نکال کر گالوں پر پف کرنے لگی اور آخر دیا سلائی کانوں میں پھیرنی شروع کر دی۔ اتنے میں سیکرٹری صاحب گھبرائے ہوئے سے اندر ہی بولے۔

''جیٹھ صاحب۔ میرا مطلب ہے سیٹھ صاحب آ گئے۔''

پھلتری بائی نے فوراً کانوں میں پھرنے والی دیا سلائی کو چکرا کر کونے میں پھینکا' لمبی ناک والے چہرے کا ایک خاص قلمی پوز بنایا اور ساڑھی کے اندر ہی اندر اس طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی کہ تھوڑی تھوڑی پنڈلیاں نظر آنے لگیں۔ اصل میں مسٹر گھڑیال بھی ابھی تھوڑی آگ سلگانا چاہتا تھا۔ مسٹر گھڑیال کی ٹانگوں میں بھی بڑی دیر سے خارش ہو رہی تھی۔ انہوں نے جلدی سے ٹانگیں کھجلائیں اور سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئے۔ اور دروازہ کھلا اور وہی کراچی والے پلپلے بھدے کالے سانڈ ایسے بے روح بوجھل پپوٹوں والے سیٹھ پھدکتے ہوئے سے اندر آئے۔ پھلتری بائی کو دیکھتے ہی نتھنے پھلا کر خرخرائے اور یوں بے دم سے ہو کر صوفوں پر بیٹھ گئے جیسے سٹیشن سے پیدل چل کر آ رہے ہیں۔ پھلتری بائی کا چڑھا ہوا مجرب سینہ دیکھتے ہی ان کا سانس چڑھ گیا تھا اور عقل ماری گئی تھی۔ فوراً خوبصورت انگلش سیٹ میں چائے آ گئی۔ پھلتری بائی بڑے انداز سے اپنے بوجھل شباب کو سنبھالتی اٹھی اور چائے بنانے لگی۔ اس نے چینی دان اٹھا کر پوچھا۔

کتنے چمچ سیٹھ صاحب؟''

گول مٹول سیٹھ تو پھول کر کپا ہو گئے۔

''جتنے جی چاہے ڈال دیجئے....... جی....... ہی ہی ہی....... ہی ہی ہی۔''

دوسرے سیٹھ نے بھی بتیسی کھول دی اور میلے کچیلے ٹیڑھے میڑھے دانت نکال کر ہنسنے لگے۔ پھلتری بائی نے خود اپنے ہاتھ سے

دونوں سیٹھوں کو چائے کی پیالیاں پیش کیں۔ جنہیں موٹے چوہوں نے کانپتے ہاتھوں اور گھومتے ہوئے سروں سے شکریئے کے ساتھ قبول کیا۔ جب مسٹر گھڑیال پروڈیوسر ڈائریکٹر کو پوری طرح یقین ہوگیا کہ ان کی عقل ٹھکانے نہیں رہی اور اب وہ نہ کچھ سن سکتے ہیں اور نہ کچھ سمجھ ہی سکتے ہیں۔ تو انہوں نے مسکراتے ہوئے رجسٹر کھولا اور کہانی سنانا شروع کی۔ اس کہانی کے انتخاب میں انہوں نے اوران کے دفتر کے سٹاف نے بڑی محنت اور شبانہ عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے پورے اعداد وشمار جمع کئے تھے کہ آج کل کس قسم کی فلمی کہانیاں چل رہی ہیں۔ پھر یہ معلوم کیا کہ کس قسم کی کہانیوں کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت لوگ پوری طرح فلمی فارمولوں کے چکر گھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور صرف سٹنٹ فلمیں ہی دل وجان سے پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی سٹنٹ فلمیں جن میں باپ جوان رہے اور بیٹا دیکھتے دیکھتے بوڑھا ڈھڈو بن جائے۔ ہیرو دشمن کی زبردست قید میں رہ کر بھی شیو بلا ناغہ کرے۔ ہیروئن بار بار ٹانگیں اس طرح اٹھا اٹھا کر ڈانس کرتی پھرتی کہ ہر سین میں کم از کم چار بار رانوں تک ننگی ضرور ہو۔ ہیرو کم از کم آٹھ مرتبہ مرتے مرتے بچے اور یوں کہانی فلم کے اختتام تک ختم نہ ہو تا کہ اس فلم کا دوسرا حصہ فلمانے کی بھی گنجائش باقی رہے۔ جب یہ طے ہوگیا کہ مسٹر گھڑیال اگلی فلم سٹنٹ بنائیں گے تو دنیا بھر کے سٹنٹ ناولوں کا اسٹاک جمع کیا گیا۔ اسٹاف کے ہر آدمی کو آڈر دیا گیا کہ وہ ایک ایک من گھڑت سٹنٹ سین کا مواد گھر سے تیار کر کے لائیں تاکہ انہیں جوڑ توڑ کر کہانی کی راہ ہموار کی جائے۔ جب کہانی کی راہ ہموار ہوگئی۔ تو مسٹر گھڑیال نے اپنے اشہب قلم کی باگیں سنبھال لیں اور کہانی کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کمرے میں اپنے آپ کو بند کر دیا اور اپنے سامنے میز پر وہ پر اسرار ہر فن مولا رجسٹر کھول دیا۔ جس میں رومانٹک سماجی' معاشرتی' کاسٹیوم' جاسوسی لڑائی مار کٹائی اور خانہ بدوشوں کی ادھوری کہانیوں کے دل ہلا دینے اور سر کے بال کھڑے کر دینے والے ہوشربا سین دنیا بھر کے ناولوں سے نقل کر کے درج کر رکھے تھے۔ مسٹر گھڑیال اس کمرے میں دو روز بند رہے۔ اس دوران میں انہوں نے چار ڈبے سگریٹوں کے ایک ایک پوری ٹوکری پانوں کی اور دو دو جن بیئر کی بوتلیں خالی کیں۔ کمرے میں ہر وقت خاموشی طاری رہتی۔ صرف کبھی کبھی اندر سے میز الٹنے' دیواروں پر مکے مارنے اور اس قسم کی چیخوں کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔ گویا کوئی جن مسٹر گھڑیال کا گلا دبا رہا ہے۔ دوسرے ہی روز کہانی تیار تھی۔ سارے اسٹاف نے سنی اور ہر آدمی تعریف و تحسین میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ مسٹر گل قند گیت نویس نے تو ایک جذباتی سین پر جس میں ہیروئن ہیرو کی اپنے سینڈل سے خوب مرمت کرتی ہے۔ سر پر دوہتڑ ماری اور چیخ مار کر مسٹر گھڑیال کے پاؤں پر لوٹنیاں کھانے لگا۔ یہی وہ عجوبہ روزگار جوبلی کرنے والی کہانی تھی۔ جسے مسٹر گھڑیال اب کراچی کے سیٹھوں کو سنانے والے تھے۔

مسٹر گھڑیال نے رجسٹر کا پہلا صفحہ کھولا۔ سگریٹ کونے میں پھینکا' دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے آنکھیں بند کیں' چہرے پر درد کے آثار پیدا کئے اور غرا کر بولے:

''کڑڑدھم .... بجلی چمکتی ہے....... دھڑڑدھم .... بادل گوجتا ہے۔ چھکا چھک' چھکا چھک طوفان میل بارش کو چیرتی جنگل میں چلی جا رہی ہے۔ ڈز ڈز دو فائر ہوتے ہیں آہ....... آہ....... ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ سینما ہال میں بیٹھے لوگ چونک کر دیکھتے ہیں۔ ریل کی کھڑکی میں سے ایک لاش دھڑام سے دریا میں گرتی ہے۔....... کٹ .... ماہی گیروں کی بستی میں ڈانس اور گانا ہو رہا ہے۔ کٹ ماہی گیر لڑکی دریا میں لاش دیکھتی ہے ڈز....... ایک اور فائر ہوتا ہے۔ لڑکی گرتی ہے' لاش دریا میں ابھر کر تیرتی ہوئی لڑکی کے پاس آتی ہے۔ لاش لڑکی کو اٹھا کر جنگل میں غائب ہو جاتی ہے۔ کڑڑدھم۔ بجلی .... نہیں .... جنگل میں شیر کی دھاڑ گونجتی ہے۔''

دونوں سیٹھ اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر دہشت کے آثار طاری تھے۔ کہانی شروع رہی۔ پھلجڑی بائی برابر اپنی برہنہ پنڈلیوں کو آہستہ آہستہ ہلاتی اور سگریٹ پیتی رہی۔ مسٹر گھڑیال کہانی سنانے میں پوری طرح غرق ہو چکے تھے۔ چہرہ پسینے میں تربتر تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ گریبان کھلا تھا۔ ہاتھ بار بار فضا میں گردش کر رہا تھا اور بار بار دھم سے میز پر آن گرتا تھا اور سیٹھ صاحب کانپ کانپ جاتے تھے۔ ایک جذباتی سین آ گیا۔ پھر کیا تھا۔ مسٹر گھڑیال کے پوں بارہ ہو گئے۔ وہ دیر سے اس سین کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے جلتا ہوا سگریٹ کونے میں پھینکا۔ کھانس کر گلا صاف کیا۔ سر جھٹک کر بالوں کو پریشان کیا۔ گریبان چاک کیا۔ گھم سے سینے پر مکہ مارا اور بے قراری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ فضا میں پھیلا اور چیخے:

بیٹا!....... بیٹا! میرے بڑھاپے پر ترس کھاؤ۔

مت ستا ظالم کسی کو مت کسی کی آہ لے

ہل کے آ جانے سے ناداں عرش بھی ہل جائے ہے

آہ' کیا میں اس دن کے لئے بوڑھا ہوا تھا کہ فلک کج رفتار کے ستم ہائے بے جا کی ناز برداریوں میں اپنا سینہ چھلنی کروں' کباب سیخ کی طرح غم و آلام کے انگاروں پر مرغ بسمل بن کر لوٹوں' مگر میرا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ اس زندگی سے تو موت بہتر ہے بیٹا۔ آج باپ اپنے بیٹے میں اولاد کی بے وفائیوں کا خنجر چلاتا ہے' آج بے کسی اپنے گریبان کو چاک کرتی ہے' آج معصومیت اپنا سر ننگا کر کے اس پر گونگا پہلوان کا گرز مار کر ہلاک ہوتی ہے۔ آہ....... !''

اتنا کہہ کر مسٹر گھڑیال نے آخری پانسہ پھینکا' وہ جوش غم سے کانپتے لرزتے جھولتے ہوئے دوڑے اور دھڑام سے کراچی کے سیٹھ کے قدموں میں گر کر زخمی پرندے کی طرح تڑپنے پھڑکنے لگے۔ سیٹھ تو دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ سانس اوپر کے اوپر اور نیچے کے نیچے تھے۔ انہوں نے مسٹر گھڑیال کو بڑی محبت سے اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔ دونوں سیٹھوں کی پیلی پیلی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ کہانی پاس ہوگئی۔ سیٹھ صاحب نے بیس ہزار کا چیک لکھ کر دیا اور میلے رومال سے آنسو پونچھتے پھلتری بائی کا سہارا لئے دفتر سے باہر نکلے۔ باری باری زور سے ناک صاف کی۔ گاڑی میں بیٹھے اور روتے ہچکیاں بھرتے واپس چلے گئے۔ مسٹر گھڑیال نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ پھلتری بائی کا چٹاخ سے ایک زبردست بوسہ لیا اور سیکرٹری کو چیخ مار کر بلایا۔ اسے سو کا نوٹ تھما کر کہا:

''وہسکی....... فوراً.......''

◆◆◆